اشاعت کا ۹۷واں سال

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

جولائی ۲۰۱۹ء

۱۵؍روپے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

اتر پردیش کی گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل گورنر ہاؤس کے احاطہ میں پریڈ کی سلامی لیتے ہوئے (۲۹؍جولائی ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کی نومنتخب گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل کو گورنر ہاؤس میں جسٹس گووند ماتھر حلف دلاتے ہوئے (۲۹؍جولائی ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کی نومنتخب گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ
گورنر ہاؤس میں اسکولی بچوں سے ملاقات کرتے ہوئے (۲۹؍جولائی ۲۰۱۹ء)

جلد : ۷۴ شمارہ:۳

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جولائی ۲۰۱۹ء

پبلشر: ششر

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹوریل بورڈ

شرینواس ترپاٹھی، غزال ضیغم

ایڈیٹر

سید عاصم رضا

فون: 9936673292

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

تصاویر: فوٹو سیکشن، محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات ۲

مضامین

پروفیسر نیر مسعود حیات اور فکری جہات ..... ڈاکٹر رفیق احمد ۳

نئی تاریخیت اور نئی مارکسیت ..... کہکشاں لطیف ۸

دبستان لکھنؤ کل اور آج ..... محی بخش قادری ۱۳

ماہنامہ شمع ادب؛ ایک نظر میں ..... نیاز سلطانپوری ۱۹

در جہان رنگ و بیک مرد خوش اطوار بود ..... مرغوب حیدر عابدی ۳۴

جوش ملیح آبادی کی فطری شاعری ..... ڈاکٹر رضیہ پروین ۳۹

فانی کی شاعری کے کچھ اہم رموز ونکات ..... گلشن بانو وفا ۴۲

افسانے

انمول تجارت ..... پروفیسر افسانہ خاتون ۴۵

خالی پنجرہ ..... سلمیٰ حجاب ۴۸

قصۂ آدم وابلیس ..... محمود یٰسین ۵۱

سودا ..... محمد علیم اسماعیل ۵۶

غزلیں

نظمیں ..... قمر ادیب ۵۸

غزل ..... ڈاکٹر مخمور رکاکوروی ۵۸

غزلیں ..... پی پی شریواستورند، خادم شبیر نصیر آبادی ۵۹

غزلیں ..... مشتاق جاوید، سید ابن حسن ۶۰

غزلیں ..... فہیم بسمل، شمسی قریشی ۶۱

غزلیں ..... جمال قدوسی، فوزیہ اختر ردا ۶۲

غزلیں ..... ڈاکٹر رؤف خیر، محمد توحید الحق ۶۳

تبصرہ

فکر کی نقاشیاں ..... (شاعر: ساغر وارثی) ..... ڈاکٹر غلام اشرف قادری ۶۴

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

جولائی ۲۰۱۹ء کے شمارہ کو کافی تاخیر سے پیش کرنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اس شمارہ میں چند بہت اچھے تنقیدی و علمی مضامین ہم پیش کر رہے ہیں۔ اس میں پہلا مضمون پروفیسر نیر مسعود حیات اور فکری جہات پر ڈاکٹر رفیق احمد کا ہے۔ پروفیسر نیر مسعود ہمہ جہت ادیب تھے وہ فارسی کے استاد اور بہت اچھے مترجم کے ساتھ اردو کے معتبر محقق و ناقد اور افسانہ نگار تھے انھوں نے اردو مرثیہ اور میر انیسؔ پر جو کام کیا وہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے مرثیہ کا مطالعہ کرتے وقت لوگوں کے سامنے صرف اس کا ادبی پہلو رہتا ہے لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے یعنی مرثیہ کی پیشکش۔ اس کو کس طرح پڑھا جائے جہاں اودھ میں مرثیہ کو فروغ ہوا وہیں اس کے پڑھنے کے انداز اور سلیقہ میں بھی فروغ ہوا۔ نیر مسعود نے مرثیہ کے اس پہلو پر بھی جس میں سوزخوانی بھی شامل ہے بہت اچھا کام کیا۔ نیر مسعود محقق و ناقد کے ساتھ ایک بلند پایہ اور منفرد افسانہ نگار تھے۔ انھیں ان کے افسانوں پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ بھی ملا لیکن اس سے زیادہ اہمیت ان کے افسانوں کے اسلوب کی ہے۔ نیر مسعود کے افسانے اپنی فکر اور ثقافتی قدروں کی وجہ سے اردو کے اہم افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیق احمد نے بڑی توجہ سے نیر مسعود کی فکری جہات پر مضمون لکھا ہے۔

اس شمارہ میں ایک مضمون نظریاتی تنقید پر یعنی 'نئی تاریخیت اور مارکسیت' پر بھی شامل ہے۔ نئی تاریخیت کا تعلق ادبی تھیوری سے ہے جس کے ذریعہ ہم ہسٹری کو ادب کے ذریعہ اور ادب کو اس کے ثقافتی حوالوں کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ 1950 میں تاریخ میں کلچرل پوئیٹکس کی شکل میں اس کی ابتدا ہوئی۔ 1980 میں ادب اور تنقید میں اس کا فروغ شروع ہوا۔ نئی مارکسزم کا تصور بھی ادب میں ایک جدید تصور ہے۔ جو ایک طرح سے مارکسزم کی توسیع ہے جس میں دوسری ادبی تھیوری بھی شامل ہے۔ ان جدید ادبی و تنقیدی نظریات پر ڈاکٹر کہکشاں لطیف کا بہت اچھا مضمون شامل اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ محی بخش قادری کا مضمون 'دبستان لکھنؤ کل اور آج ایک اہم جائزہ' ہے۔ دبستان لکھنؤ کا جب ذکر آتا ہے تو ایک خاص طرح کا تصور زبان و بیان کے سلسلہ میں ابھرتا ہے لیکن گزشتہ سو برس میں اس تصور میں کیا تبدیلی آئی کیا دبستان لکھنؤ آج بھی اسی طرح سے ہے جس طرح سے ناسخ کے زمانے میں تھا، محی بخش قادری صاحب نے تفصیل سے ادب میں ہونے والی تبدیلیوں اور دبستان لکھنؤ پر ان کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ ماہنامہ شمع ادب اردو کا ایک قدیم ماہنامہ ہے جسے مشہور شاعر سید توکل حسین نیر سلطانپوری، سلطانپور سے شائع کرتے تھے اپنے عہد میں یہ ایک مقبول رسالہ رہا ہے جس میں اس زمانے کے علمی و ادبی مباحث کو رسالہ میں نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ اس طرح شمع ادب ایک ادبی تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیاز سلطانپوری نے 'ماہنامہ شمع ادب ایک نظر میں' کے عنوان سے شمع ادب کے اشاریئے کا ایک خاکہ پیش کیا ہے جس میں صرف مضامین کا ہی ذکر کرنا ممکن ہو سکا ہے۔ غزلیات اور افسانوں کا ذکر کرنا ممکن نہ تھا جس کے لئے بہت تفصیل درکار تھی۔ اس طرف توجہ کر کے اردو ادب کا بہت بڑا کام کیا ہے۔

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی
نیا دور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال
واٹس اپ اور ویب سائٹ پر
قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کئے جا رہے ہیں

رضیہ پروین نے جوش ملیح آبادی کی فکری شاعری اور گلشن بانو وفا نے فانی کی شاعری کے کچھ اہم رموز و نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ جوش و فانی دونوں ہمارے عہد کے بہت اہم شاعروں میں ہیں اس لئے ان مضامین کا مطالعہ اہمیت سے خالی نہیں ہوگا۔ مضامین کے حصہ میں مرغوب حیدر عابدی کا مضمون 'در جہان رنگ و بو یک مرد خوش اطوار بود' جو کہ سید شریف الحسن نقوی سابق سکریٹری اردو اکادمی، دہلی کی ادبی خدمات پر ایک تفصیلی گفتگو بھی شامل اشاعت ہے جسے آپ پسند کریں گے۔

اس شمارہ میں تین افسانے انمول تجارت، پروفیسر افسانہ خاتون، خالی پنجرہ، سلمیٰ حجاب، قصۂ آدم وابلیس، محمود یٰسین، سودا، محمد علیم اسماعیل شامل اشاعت ہے۔ یہ افسانے آپ کو پسند آئیں گے کہ یہ آج کی زندگی کا قصہ ہیں۔

منظوم حصہ میں قمر ادیب، مخمور کاکوروی، پی پی شریواستو رند، خادم شبیر نصیر آبادی، مشتاق جاوید، سید ابن حسن، فہیم بسمل، شمسی قریشی، جمال قدوسی، فوزیہ اختر ردا، ڈاکٹر رؤوف خیر اور محمد توحید الحق کا کلام اور ساغر فاروقی کی کتاب 'فکر کی نقاشیاں' پر غلام اشرف قادری کا تبصرہ شامل اشاعت ہے۔ مجھے یہ خبر دیتے ہوئے بہت افسوس ہے کہ جولائی کے مہینہ میں ہمارے دو بہت محترم ادیب ہم سے جدا ہو گئے۔ خطیب العرفان مولانا مرزا محمد اشفاق صاحب شوقؔ لکھنوی، جو کہ ایک اچھے ذاکر اور ایک اچھے شاعر اور لکھنؤ کی ادبی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے، نے نیر سلطانپوری نمبر کے لئے ان کی منقبتی شاعری پر مضمون لکھا تھا۔ اسی طرح ایس ایم عباس ایڈوکیٹ جونپور کے بزرگ ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف رہے ہیں جو کہ نیر سلطانپوری کے ماہنامہ شمع ادب میں ان کی کافی تخلیقات شائع ہوتی تھیں، نے نیر سلطانپوری کی شخصیت پر مضمون لکھا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ نیر سلطانپوی نمبر ان حضرات کی زندگی میں نہیں شائع ہو سکا۔ ان حضرات کا اس طرح اچانک جدا ہونا اردو ادب کے لئے بڑا خسارہ ہے ادارہ نیا دور ان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے ورثا کو اس غم کو برداشت کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔

ایک بات

اردو ہندوستان کے گوشے گوشے میں سمجھی اور بولی جانے والی زبان ہے۔ اس زبان کی حفاظت اور فروغ سب کا فرض ہے اردو خود پڑھئے اور بچوں کو پڑھائے۔

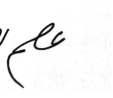

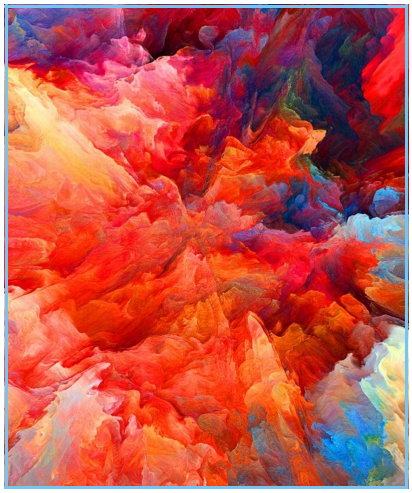

پروفیسر نیر مسعود: حیات اور فکری جہات

ڈاکٹر رفیق احمد

شعبۂ اردو

ڈی سی ایس کے (پی جی) کالج

مئوناتھ بھنجن

رابطہ: 9236126977

اردو فکشن، تحقیق وتنقید، فارسی ادبیات، ترجمہ نگاری، رثائی ادب اور سوانح نگاری کے حوالے سے عصر حاضر کی نامور علمی وادبی شخصیت پروفیسر نیر مسعود کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ نیر مسعود نے درس وتدریس کے مقدس پیشہ سے وابستہ رہتے ہوئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اسے آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے، معلمی کے پیشے سے جڑے ہونے کیوجہ سے ان کے ہونہار اور لیاقت مند شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، ان مخلص شاگردوں نے اپنی شاگردی کا پورا پورا حق بھی ادا کیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ایک اچھے اور تجربہ کار استاد کی شناخت خود اس کے سعادت مند شاگردوں ہی سے ہوا کرتی ہے۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو پروفیسر نیر مسعود صاحب اردو کے نامور شاعر مرزا اسداللہ خان غالبؔ کی طرح بڑے ہی خوش نصیب واقع ہوئے ہیں کہ انکو مولانا الطاف حسین حالیؔ کی طرح بہت سے شاگرد ملے ہیں جو اپنے استاد کی قابل قدر علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں نیرّ شناسی کی راہیں ہموار کر رہے ہیں اور واقعی یہ ایک قابلِ تحسین کام ہے۔

اردو کے افسانوی ادب کو نیر مسعود کی تحریروں نے جو وزن اور وقار بخشا ہے اس کا اعتراف ہمارے عہد کے ناقدین فن اور تحقیق نگاروں نے ابھی ٹھیک ڈھنگ سے نہیں کیا ہے، نیر مسعود اس عہد کا ایک کثیر الجہات فن کار ہے جس نے اپنے افسانوں میں زندگی کے سلگتے ہوئے موضوعات پر بڑی جرأت مندی سے اظہار خیال کیا ہے، وہ اپنے کرداروں کے حوالے سے کسی بھی موضوع کی تہہ تک قارئین کو لے جانے کے فن سے واقف ہیں شاید یہی وجہ ہے کی ان کے بعض افسانے عام قارئین کی فہم وادراک سے بالاتر ہوا کرتے ہیں پھر بھی بہ حیثیت مجموعی اردو فکشن میں انکی شناخت انفرادی لحاظ سے تسلیم شدہ ہے۔

اردو زبان وادب اور فکشن کی تاریخ میں مشہور ناول نگار ''آگ کا دریا'' کی مصنفہ قرۃ العین حیدر کو اگر سجاد حیدر یلدرمؔ کی بیٹی ہونے پر فخر تھا تو پروفیسر نیر مسعود کو بھی مسعود حسن رضوی ادیبؔ کا بیٹا ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہ قابل فخر بات بھی ہے کہ نیر مسعود نے کبھی ''پدرم سلطان بود'' کے فارمولے کا بیجا اور غلط استعمال نہیں کیا بلکہ فارسی کے مقولہ ''من آنم کہ من دانم'' کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو ادب اور فکشن کی تاریخ میں اپنی شناخت اور پہچان خود بنائی اور مشہور مقولہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کی صحیح معنوں میں تصویر پیش کی ہے۔

نیر مسعود صاحب سادہ لوح، نیک دل، دیانت دار اور کسی حد تک کافی خوددار قسم کے انسان تھے ان کی پوری زندگی ایک آئیڈیل اور مثالی استاد کی مانند تھی جو دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف تھی۔

سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی سات اولادوں میں نیر مسعود پانچویں نمبر پر تھے جنکی تعلیم و تربیت لکھنؤ کے علمی و ادبی خانوادے اور ماحول میں ہوئی، کسی بھی علمی و ادبی شخصیت کو عزت و شرف اور اقبال و بلندی عطا کرنے میں خاندانی پس منظر کا رول بہت ہی اہم ہوا کرتا ہے۔

اس لحاظ سے اگر نیر مسعود کی زندگی کے مختلف گوشوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے آباو اجداد نیشاپور سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور انکی یہ نقل مکانی غالباً فکر معاش اور تلاش روزگار کے لئے انہیں اتر پردیش کے مشہور ضلع اناؤ تک لائی اور اسی ضلع کے ایک غیر معروف قصبہ ''نیوتنی'' میں نیر مسعود کے آباواجداد نے مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔

نیر مسعود کے تعلق سے دستیاب شدہ خاندانی شجرہ، سوانحی کوائف، تاریخی دستاویزات اور خود سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی تحریروں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے والد حکیم سید مرتضیٰ حسین رضوی شہر بہرائچ میں اُن دنوں طبابت کے پیشہ سے وابستہ تھے، مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی والدہ کا نام ہاشمی بیگم تھا انہیں کے بطن سے مسعود حسن رضوی ادیب کی ولادت ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو ہوئی۔

حکیمی کے پیشہ سے وابستگی کی وجہ سے نیرؔ مسعود کے دادا حکیم سید مرتضیٰ حسین رضوی کی شخصیت کافی حد تک منکسر المزاج تھی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے نیر مسعود نے لکھا ہے کہ: ''ان کے دادا بے حد غیر معتدل اور کسی حد تک پُر اسرار شخصیت کے مالک تھے''۔

مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے اہل خاندان کے احوال میں لکھا ہے کہ ہمارے والد کا انتقال تقریباً ۱۹۰۳ء میں چالیس سال کی عمر میں بہرائچ میں ہوا اس وقت میں دس سال کا بچہ تھا۔ میری ابتدائی تعلیم بہرائچ ہی میں ہوئی، میری ماں بیگم ہاشمی نے میری تعلیم و تربیت میں جو دشواریاں برداشت کی ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔

نیرؔ مسعود کے والد مسعود حسن رضوی ادیب نے ۱۹۰۸ء میں ساتویں درجہ کا امتحان پاس کرنے کے بعد ماں کے ساتھ لکھنؤ ہجرت کی اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

والد کے انتقال کیوجہ سے مسعود حسن رضوی ادیب کے گھر کی معاشی حالت اس وقت ناگفتہ بہ تھی پھر بھی نامساعد حالات اور مالی دشواریوں کے باوجود انہوں نے چودہ سال کی عمر میں ۱۹۱۳ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ نیر مسعود کے والد نے لکھنؤ سے ۱۹۱۵ء میں انٹر اور ۱۹۱۷ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء میں محکمہ تعلیمات کے شعبہ میں ملازمت مل گئی، اس طرح انکی ادبی زندگی کا آغاز ہوا اور آدیبؔ تخلص اختیار کیا مگر شاعری کو اظہار بیان کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ نثر نگاری کے میدان میں نام پیدا کیا اور آگے چل کر یہی انکی شہرت کا باعث بھی ہوا۔

سطور بالا میں نیرؔ مسعود کے خاندانی پس منظر اور انکے والد کی تعلیم و تربیت کو بیان کرنے کا ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ نیر مسعود کے والد نے بڑی جانفشانی سے علم و ادب کی دشوار گزار راہوں کو طے کیا ہے جس کا احساس خود انکے بیٹے نیر مسعود کو بھی تھا شاید اسی لئے کبھی بھی نیرؔ مسعود نے اپنی کسی بھی معمولی سی حرکت سے بھی اپنے خاندان کی عزت و ناموس کو ذرّہ برابر بھی نقصان نہیں پہونچایا ہے، بلکہ ان کی علمی و ادبی اور سماجی خدمات کیوجہ سے نیر مسعود نے خود اپنا نام روشن کرنے کے ساتھ ہی اپنے خاندان کا نام بھی روشن کیا ہے، میرے خیال میں نیر مسعود اردو زبان ادب اور فارسی ادبیات کا نیر تاباں اور روشن چراغ تھے جنکی شعاعوں سے علم و ادب کی قندیل ہمیشہ جلتی اور منور ہوتی رہے گی۔

مسعود حسن رضوی ادیب کی شادی لکھنؤ کے صوفی شاعر شاہ نعمت حکیم سید محمد اصغر جعفری کی بیٹی حسن جہاں عرف حسینہ بیگم سے ۱۹۲۶ء میں ہوئی جن سے سات اولادیں ہوئیں۔

سید نیرؔ مسعود رضوی کی ولادت علم و ادب کی راجدھانی لکھنؤ میں ۱۶ نومبر ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔ ماں کا نام حسن جہان عرف حسینہ بیگم بنت شاہ نعمت حکیم سید محمد اصغر جعفری ہے، حسینہ بیگم سے سات اولادیں ہوئیں جن میں ۴ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں جنکی ترتیب یوں ہے۔

۱۔ ارجمند بانو بیگم
۲۔ اختر مسعود رضوی
۳۔ برجیس بانو بیگم
۴۔ انیس بانو بیگم
۵۔ نیر مسعود رضوی
۶۔ انور مسعود رضوی
۷۔ اظہر مسعود رضوی

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نیرؔ مسعود کی بہن ارجمند بانو بیگم ''اردو مرثیے کا ارتقاء'' نامی مشہور و مقبول کتاب کے مصنف پروفیسر مسیح الزماں کی اہلیہ تھیں۔

نیر مسعود کی ابتدائی تعلیم لکھنوی مزاج و ماحول میں بڑے ہی اچھے انداز میں ہوئی، ابتدائی اور ثانوی تعلیم گردھاری سنگھ اسکول میں حاصل کی اور بعد میں اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی کے لئے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور یہیں سے بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔اے کا امتحان ۱۹۵۷ء میں پاس کیا، ایم۔اے فارسی زبان میں کیا۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کا رخ کیا اور یہاں سے ۱۹۶۵ء میں اردو میں ''رجب علی

بیگ سرور'' پر مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور پھر ۱۹۶۶ء میں فارسی زبان کے مشہور شاعر ''ملا محمد صوفی مازندرانی'' پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

نیر مسعود کی ملازمت کا آغاز گاندھی فیض عام اسلامیہ کالج بریلی سے ہوا یہاں پر انکی تقرری ۱۹۶۵ء میں ہوئی پھر چند ہی مہینے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں ۱۹۶۵ء میں بہ حیثیت لکچرر آپ کی تقرری ہوئی یہاں پر آپ درس و تدریس کے مقدس پیشہ سے وابستہ رہے اور تشنگانِ علوم کی آبیاری کرتے رہے اور تقریباً ۳۴ سال کی طویل علمی و ادبی اور تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو فارسی شعبہ کے صدر کے منصب سے سبکدوش ہوئے۔

نیر مسعود کی شادی ۳۵ سال کی عمر میں ۱۹۷۱ء میں شبینہ خاتون سے ہوئی۔آپ کی چار اولادوں میں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں جنکے نام یوں ہیں۔

۱۔ تمثال مسعود
۲۔ دردانہ مسعود
۳۔ صائمہ مسعود
۴۔ ثمرہ مسعود

نیر مسعود ایک علمی و ادبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے گھر کے علمی ماحول اور لکھنوی تہذیب و ثقافت کا اثر انکی ابتدائی زندگی پر اتنا خوشگوار ثابت ہوا جو آگے چل کر انکی شخصیت کو نکھارنے اور پروان چڑھانے میں مددگار رہا۔

اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

''ہمارا گھر بہت مہذب اور شریف گھر سمجھا جاتا تھا والد اردو اور فارسی کے عالم تھے، گھر کا ماحول شریفانہ تھا۔مگر جب مجھے اسکول میں داخلہ ملا تو وہاں بالکل دوسری دنیا تھی، وہاں جا کر بہت آزادیاں دکھائی دیں،لیکن اس کا برابر احساس رہا کہ ہم بہت شریف اور مشہور آدمی کے لڑکے ہیں۔گرمی میں برسات کے موسم میں جب باہر کھیل نہیں سکتے تھے تو سارا سارا دن پڑھتے رہتے تھے۔ چونکہ پڑھنے کا شوق تھا اس لئے اب یقین کرنا مشکل ہے کہ پانچ سال کی عمر میں محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' پڑھ چکا تھا۔دس سال کی عمر تک ''دربار اکبری اور کئی دوسری موٹی موٹی کتابیں پڑھ چکا تھا''

(شب خون،شمارہ مئی،جون ۱۹۹۹ء صفحہ ۴۵،۴۶)

یہاں یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ نیر مسعود نے پانچ سال کی عمر میں ہی ''آب حیات'' جیسی اردو زبان و ادب کی گراں قدر اور منفرد اسلوب کی حامل کتاب پڑھ لی تھی اور یہ بات انہوں نے ساگر سین گپتا کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں کہی ہے جس کے کچھ حصے جدیدیت کے علمبردار معتبر رسالہ ''شب خون'' کے مذکورہ شمارہ میں شائع ہوئے ہیں۔

بہر حال نیر مسعود کو چاہئے تھا کہ جس کتاب کو انہوں نے معمولی سی عمر میں پڑھا اس کے بارے میں بھی عمر کی آخری منزل میں ہی کچھ لکھتے مگر میری ناقص معلومات محدود مطالعہ اور دانست کی حد تک انہوں نے نہ تو ''آب حیات'' کے بارے میں قلم اٹھایا اور نہ ہی اس کتاب کے مصنف محمد حسین آزاد کے بارے میں ہی کچھ لکھا ہے کاش!اس جانب نیر مسعود توجہ دیئے ہوتے۔

رثائی ادب،تحقیق و تنقید اور اردو افسانوں کے حوالے سے نیر مسعود کا نام انفرادی حیثیت کا حامل ہے یہ ایک ایسے قلندر صفت دانشور گزرے ہیں جنکی جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنے ادیبوں اور قلم کاروں کو بہت جلد ہی فراموش کر جاتے ہیں، جیتے جی ہم ان کی تملق و چاپلوسی میں کوئی کمی نہیں کرتے اور جیسے ہی کوئی ادیب و شاعر اپنی آنکھ بند کر لیتا ہے تو ہم اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔جبکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ ہم ان کی زندگی ہی میں اپنے ادیبوں کی علمی و ادبی خدمات کا کھل کر اعتراف کریں اور ان کو خراج تحسین پیش کریں اب جبکہ نیر مسعود ہمارے درمیان نہیں رہے تو ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم انکی غیر مطبوعہ تخلیقات کو منظر عام پر لائیں تاکہ آنے والی نسلیں نیر مسعود کی گراں قدر خدمات سے لاعلمی کا شکار نہ ہوں۔

نیر مسعود کافی سادہ لوح، خاموش مزاج، نرم گفتار، نیک دل، اصول پسند اور مہذب انسان تھے، کردار اور گفتار کے غازی تھے اپنے آپ کو جوڑ توڑ کی سیاست سے کوسوں دور رکھا۔ادبی گروہ بندی کے قائل نہیں تھے، ریا و نمود سے بھی کوئی واسطہ نہیں تھا، خودداری وراثت میں ملی تھی، مبالغہ آرائی اور تملق و چاپلوسی سے اپنے کو ہمیشہ بچائے رکھا،علم و ادب کے بے لوث خادم اور اردو زبان کے سچے بہی خواہ تھے، بہ حیثیت استاد کامیاب اور تجربہ کار مدرس تھے، شاگردوں کی حوصلہ افزائی پر خصوصی دھیان دیتے تھے،علم و ادب کی دنیا میں وہ کثیر الجہات فنکار تھے، جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا، مجموعی طور پر رثائی ادب، سوانح اور اردو افسانوں پر خصوصی دسترس حاصل تھی، فارسی شعریات و ادبیات، میرؔ و انیسؔ اور غالبؔ وغیرہ پر بھی ان کے تحقیقی و تنقیدی کارنامے قابل تحسین ہیں۔

اردو زبان و ادب کے نامور دانشور پروفیسر انیس اشفاق کے بقول:

''۱۹۶۵ء میں ان کے مضامین بڑوں کے رسالوں میں چھپنا شروع ہوئے'' رجب علی بیگ سرورؔ پر ان کا تحقیقی مقالہ بہترین تحقیقی کام ہے، انیسؔ اور مرثیے سے متعلق ان کی اہم کتابوں میں ''مرثیہ خوانی کا فن'' معرکۂ انیس و دبیر'' اور انیس (سوانح) اپنے موضوعات پر سند کا درجہ رکھتی ہیں، یہ کتاب نیر مسعود کی برسوں کی محنت اور تحقیق کا ثمرہ ہے، برصغیر سے باہر مغرب کی ادبی دنیا میں پروفیسر نیر مسعود کو جس چیز سے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی وہ ان کی افسانہ نگاری ہے،انہوں نے ۱۹۷۰ء

کے آس پاس اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔''

عصر حاضر میں نیر مسعود کی تہہ دار علمی شخصیت کئی لحاظ سے نمایاں اور انفرادی حیثیت کی حامل رہی ہے، وہ بیک وقت ماہر انیسیات، سوانح نگار، افسانہ نویس، محقق و ناقد، ترجمہ نگار اور فارسی ادبیات کے ماہر تھے، تحقیق و تنقید اور علم و ادب کے مختلف موضاعات پر تقریباً دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف پروفیسر نیر مسعود کے مطبوعہ مقالات و مضامین، تبصرے اور افسانوں کی مجموعی تعداد تقریباً تین سو تک پہونچتی ہے۔

نیر مسعود ایک اچھے خاکہ نویس بھی تھے مختلف علمی و ادبی شخصیات پر انہوں نے جو گراں قدر خاکے لکھے ہیں ان میں خاص طور پر رشید حسن خان، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر احتشام حسین، مولانا علی نقی اور بیگم حضرت محل پر لکھے ہوئے ان کے خاکے بڑی اہمیت کے حامل ہیں، شخصی خاکوں کا مجموعہ ''ادبستان'' کراچی سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔

نیر مسعود ایک بسیار نویس فن کار اور قلم کار گزرے ہیں جنہوں نے اردو کے افسانوی ادب کو اپنے نمائندہ افسانوں سے جو وزن اور وقار بخشا ہے اس کی داد نہ دینا بڑی کم ظرفی کی بات ہے، وہ ایک بلند پایہ افسانہ نگار تھے جن کے بہت سے افسانے دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں اردو کے افسانوی ادب میں نیر مسعود کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے ان کے مطبوعہ چار افسانوی مجموعے ''سیمیا، عطر کافور، طاؤس چمن کی مینا اور گنجفہ'' ہی کافی ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پروفیسر نیر مسعود کے افسانوی مجموعہ ''طاؤس چمن کی مینا'' پر انہیں ۲۰۰۱ء میں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا ہے، اس کے علاوہ ان کی مجموعی علمی و ادبی اور افسانوی خدمات کے صلے میں ان کو غالب ایوارڈ، صدر جمہوریہ ایوارڈ برائے فارسی زبان اور کتھا ایوارڈ وغیرہ بھی مل چکا ہے۔ ''نیر مسعود کو ۱۹۷۹ء میں پدم شری اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۷ء میں سرسوتی سمّان بھی مل چکا ہے۔

فارسی ادبیات کے حوالے سے بھی نیر مسعود کی علمی و تحقیقی خدمات نا قابل فراموش ہیں اس سلسلے میں بطور مثال ان کی ۳۱ سال کی طویل علمی و تدریسی خدمات کو پیش کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے لکھنؤ یونیورسیٹی میں شعبۂ فارسی سے وابستگی کے ساتھ انجام دی ہیں، انتہائی افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ پروفیسر نیر مسعود نے ۱۹۶۶ء میں جو تحقیقی مقالہ ملا محمد صوفی مازندرانی کے دیوان کی تصحیح و تدوین کے تعلق سے لکھا تھا جس کے نگران لکھنؤ یونیورسیٹی کے فارسی شعبہ کے پروفیسر نذیر احمد تھے جس مقالہ پر نیر مسعود کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی ابھی تک یہ غیر مطبوعہ ہے۔ کاش! اس جانب نیر مسعود کے لائق شاگرد وغیرہ خصوصی توجہ دیتے تو یہ کام منظر عام پر آ سکتا ہے، فارسی زبان و ادب کے حوالہ سے نیر مسعود کا ایک اہم کام میر تقی میرؔ کے فارسی دیوان کی ترتیب و تصحیح بھی ہے، دو سو چالیس صفحات پر مشتمل میر کا یہ فارسی دیوان مجلہ نقوش، لاہور کے میر نمبر شمارہ ۳ میں ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ فارسی افسانوں کے کئی اردو تراجم بھی موقر رسائل و جرائد آجکل، شب خون اور نیا دور وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں، فارسی زبان و ادب پر ان کے بہت سے مضامین و مقالات ماہنامہ معارف، کتاب، جامعہ، شیرازہ اور اردو ادب وغیرہ نامور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

فارسی زبان و ادب کے میدان میں انکی گراں قدر علمی و ادبی اور تدریسی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت ہند نے پروفیسر نیر مسعود کو صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا ہے، جو بڑے ہی فخر کی بات ہے۔ رثائی ادب اور انیسیات پر نیر مسعود کو قدرت کاملہ حاصل تھی اردو مرثیے کے حوالے سے نیر مسعود کا نام بڑی انفرادیت رکھتا ہے انہوں نے تقابلی مطالعے پر جو کچھ بھی لکھا ہے اسے اگر چہ حرف آخر تو نہیں کہا جا سکتا ہے مگر انہوں تنقید و تحقیق اور تقابلی اسلوب کا جو معتدل اور متوازن رویہ اختیار کیا ہے وہ قابل تعریف اور کسی حد تک قابل تقلید بھی ہے۔

غالباً اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے عصر حاضر کے نامور ادیب و دانشور محترم پروفیسر مجاور حسین رضوی صاحب نے لکھا ہے:

> ''میں ان کی انصاف پسندی کا قائل تھا، مرزا دبیر مرحوم و مغفور کے ساتھ موازنہ کرنے میں انہوں نے کہیں بے جا طرفداری سے کام نہیں لیا تھا اور نہ انیس کے سلسلے میں ہیرو پرستی کا مظاہرہ کیا تھا۔''

انیس شناسی، انیس فہمی اور متعلقات انیس پر یوں تو بہت سی معیاری دستاویزی اور مستند کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جو اپنے فن اور اسلوب کے لحاظ سے بڑی ہی معنیٰ خیز ہیں، ادھر حالیہ چند پرسوں میں نامور شاعر اور مرثیہ نگار میر انیس کے حوالے سے جو چند اور اہم گراں قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں پروفیسر نیر مسعود کی کتاب انیس (سوانح) بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کو سوانحی ادب میں وہی مقام و مرتبہ اور حیثیت حاصل ہے جو سوانح نگاری کے فن میں مولانا حالیؔ کی ''حیات جاوید، یادگار غالب'' اور علامہ شبلی نعمانی کی ''الفاروق'' کو حاصل ہے۔

نیر مسعود نے انیس شناسی کے باب میں اردو کے مایۂ ناز مرثیہ نگار میر انیس کی یہ سوانح جامع، مستند اور دستاویزی انداز میں لکھ کر اردو کے رثائی ادب میں ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ ۴۷۲ صفحات، گیارہ ابواب اور ۱۵۱ ذیلی عنوان پر مشتمل اس کتاب میں میر انیس کی زندگی کے مختلف ادبی گوشوں پر پروفیسر نیر مسعود کے ۱۹ جامع مضامین شامل ہیں اس کتاب کو ۲۰۰۲ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ رثائی ادب سے متعلق نیر مسعود کی اہم کتابوں میں ''مرثیہ خوانی کا فن''

(۱۹۸۹ء) دولہا صاحب عروج (۱۹۸۰ء) بزم انیس (۱۹۹۸ء) شہادت امام حسین کی پیشین گوئیاں (۱۹۹۸ء) اور ''معرکۂ انیس و بیر'' (۲۰۰۰ء) کو بڑی افادیت واہمیت حاصل ہے۔ نیر مسعود نے ادب کی مختلف نثری اصناف پر طبع آزمائی کی ہے وہ ایک ایسے بلند پایہ شش جہت تخلیق کار اور فن کار تھے جنہوں نے ۱۹۷۷ء میں جب ایران کا سفر کیا تو ایک سفر نامہ بھی ''خنک شہر ایران'' کے نام سے لکھا جو ۴، اگست ۱۹۷۸ء میں ''اظہار'' ممبئی میں شائع ہوا تھا۔

ہم تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صفحات کی قلت کے باعث آئندہ سطور میں نیر مسعود کی افسانہ نگاری کا مختصر جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے تا کہ فکشن کے حوالے سے نیر صاحب کی ادبی خدمات کا مختصر تعارف قارئین کے سامنے آجائے۔

اردو کے افسانوی ادب فکشن کے حولے سے نیر مسعود کا نام نمایاں اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے اردو افسانوں کو نیر صاحب نے جدید موضاعات کے ذریعہ جو ترقی بخشی ہے وہ نا قابل فراموش ہے۔ فکشن کے تعلق سے نیر مسعود کے بارے میں میری ناقص رائے ہے کہ اگر وہ چار افسانوی مجموعے ''سیمیا، عطر کافور، طاؤس چمن کی مینا اور گنجفہ'' کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے تو بھی یہ کتابیں اردو ادب میں نیر مسعود کو زندہ رکھنے کے لئے کافی تھیں۔ نیر مسعود کا پہلا افسانوی مجموعہ سیمیا ۱۹۸۴ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا جو دوسو بتیس صفحات پر مشتمل تھا جس میں پانچ افسانے شامل تھے۔ آپ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''عطر کافور'' کے نام سے ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا جس کے ناشر خود مصنف ہی تھے یہ مجموعہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل تھا، نیر مسعود کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''طاؤس چمن کی مینا'' ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آیا جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۳۶ تھی چوتھا افسانوی مجموعہ ۲۰۰۸ء میں ''گنجفہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ نیر مسعود نے ۱۹۷۱ء سے افسانہ نگاری کا آغاز کیا ان کا افسانہ ''سیمیا'' فروری، ۱۹۷۲ء ''شب خون'' الہ آباد میں شائع ہوا تھا۔ جو ان کا دوسرا افسانہ تھا پہلا افسانہ ''نصرت'' کے نام سے ''شب خون'' کے شمارہ جولائی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔

''مارگیر'' نیر مسعود کا ایک گراں قدر افسانہ ہے جو ''شب خون'' اکتوبر، ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں چھپا تھا۔ یہ وہ افسانہ ہے جس کا کردار بڑی انفرادیت کا حامل ہے۔ اسی طرح ''اوجھل'' افسانہ کا مرکزی کردار ''میں'' بھی بڑا اہم ہے، ان کی اکثر کہانیوں کا کردار واحد متکلم ہے۔ نیر مسعود کے افسانوں میں کردار نگاری بڑے ہی اچھے انداز میں ہوئی ہے، ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے قارئین اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتے ہیں بلکہ کرداروں کے تعلق سے تجسس برکرار رہتا ہے اور یہی ایک عمدہ افسانے کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے۔ نیر مسعود کے دیگر اہم افسانوں میں بڑا کواڑ گھر، آزاریاں، دست شفاء، مسکینوں کا احاطہ دنبالہ گرد اور پاک ناموں والا پتھر'' یہ وہ افسانے ہیں جن میں نیر مسعود نے معاشرے کے اہم موضوعات کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ''کتاب دار'' نیر مسعود کا وہ افسانہ ہے جس میں انہوں نے ادبی دیانت داری کو بڑے ہی سلیقے سے بیان کیا ہے ان کے اکثر افسانوں مثلاً جرگہ اور مراسلہ میں تہذیب وثقافت کو موضوع بنایا گیا ہے ان کے کچھ افسانوں میں لکھنوی تہذیب ومعاشرے کی عکاسی بھی ملتی ہے نیر مسعود کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے ابتدائی دور کے افسانوں میں جو اسلوب اختیار کیا تھا آخری دور کے افسانوں میں وہ اسلوب برقرار نہ رہ سکا پھر بھی مجموعی طور پر وہ ایک باوقار فکشن نگار، بلند پایہ ناقد اور رثائی ادب کے میر کارواں تھے جن کی وفات ۲۴ جولائی ۲۰۱۷ کو ہوئی۔ میں اپنی گفتگو پروفیسر مجاور حسین رضوی صاحب کے ان جملوں پر ختم کرتا ہوں:

''نیر مسعود صحیح معنوں میں مسعود صاحب کے جانشین اور ادبی وارث ہیں تحقیق کا جو معیار ادیبؔ نے قائم کیا تھا نیر مسعود اسکے صرف وارث ہی نہیں امین و پاسدار بھی تھے اور بلاشبہ میری نظر میں وہ اردو تحقیق کا پانچواں ستون ہیں۔''

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی۔، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **مصنف کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کے بغیر حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

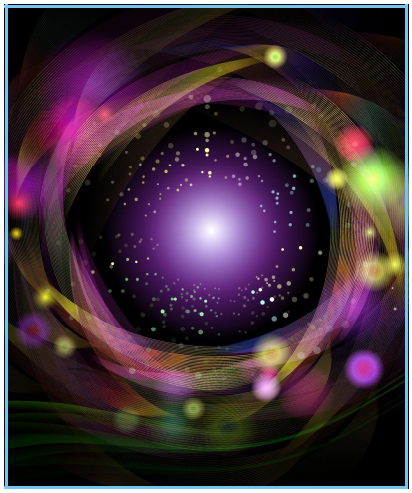

نئی تاریخیت اور نئی مارکسیت

کہکشاں لطیف

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ ترجمہ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد (تلنگانہ)

رابطہ: 9959331842

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ہر زبان و ادب میں سیاسی، سماجی، اور تہذیب و ثقافت کے تحت مختلف تصورات اور نظریات کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔ جہاں تک ادبی تنقید میں نئی تاریخیت کے نظریہ ہے کے تحت ادب میں تاریخی اقدار و روایات کی وضاحت کو اہمیت دی جاتی ہے نیز اس میدان میں یہ نظریہ سماجی اور بشریاتی علوم پر مبنی ہوتا ہے جسے تہذیبی بوطیقا سے تعبیر کیا جاتا ہے جہاں ادب کا سماجی اور تاریخی سیاق میں مطالعہ کیا جاتا ہے کہ آیا اس فن پارے میں سماجی اور تاریخی عناصر نمودار ہوتے ہیں یا نہیں؟ یعنی کوئی بھی تصور تاریخی اعتبار سے حقائق کی عکاسی کی گئی ہے یا نہیں۔

نئی تاریخیت کے ساتھ ساتھ نئی تاریخیت کے ان عناصر کی نشاندہی بھی ضروری ہے جو کسی واقعہ یا فن کا موجب بنتے ہیں تاکہ تاریخیت کا وہ تصور جو ادب اور تنقید میں شعوری یا غیر شعوری طور پر رائج رہا ہے اس کی بھی ترجمانی ہو سکے جس طرح یہ تاریخ اور ادبی پس منظر کو پیش کرتی ہے۔ اس نقطہ نظر کے آئینہ دار ناقدین متن میں وقت اور دور کو اہمیت دیتے ہیں اس طرح تاریخی سیاق کے ذریعہ ناقد کو متن کے اقدار کا تعین اور اس کی صحیح ترجمانی کرنے میں مدد ملتی ہی ہے مزید یہ کہ متن کے امکانات کو وضع کرنے میں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظریہ مختلف شکلوں میں منظر عام پر آتا رہا ہے۔

تخلیقی سطح پر اگر دیکھا جائے تو اردو میں شاعرانہ انداز میں حالی، تنقید میں شبلی نعمانی اور عبدالحلیم شرر کے ناولوں تاریخی شعور با ضابطہ طور پر ملتا ہے ااور اگر انگریزی کی طرف رخ کیا جائے تو امریکہ میں Mark Twain نے Hick Finn کے کردار کو پیش کر کے 1800 میں نسلی تعصب کو واضح کیا تھا۔ یہ کردار Mark Twain کی تخلیق The Adventures of Tom Swayer میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے جو انگریزی میں 1930 اور 1940 کی دہائی میں تاریخی تنقید کی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ Twain نے جس وقت اس کردار کو پیش کیا اس وقت امریکہ میں نسلی تعصب رائج تھا۔ تاریخ کی روشنی میں اس کی معنویت مختلف نظریہ کو پیش کرتی ہے۔ نئی تاریخیت کا آغاز وارتقا 1980 میں Formalism کے خلاف ردّعمل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ فن پارے کے متن میں ہی معنی تلاش کرتا ہے اور متن میں خارجی اثرات کی نفی کرتا ہے۔ نئی تاریخیت تاریخ کو موضوعی گردانتی ہے۔

اس کے مباحث کے تحت حقائق اور عوامل کسی فن کے وجود کا باعث بنتے ہیں ۔نئی تاریخیت نئے زمانے کے قاری کے تصورات اور انکشافات کو غور وفکر کی قوت عطا کرتی ہے۔اور متن کی افہام وتفہیم اور اس کی ترجمانی میں ایک پل کا کام کرتی ہے۔الفاظِ دیگر یہ تاریخی سیاق اور جدید دور کے قاری کے درمیان رابطہ قائم کرتی ہے جہاں تاریخی نقاد کا نقطہ نظر، تہذیبی اور سماجی عوامل تخلیقی ترغیب کے ساتھ بتدریج شامل ہوتے رہتے ہیں نیز اس کے اقدار و روایات کی سمت متعین کرتے ہیں۔اسی طرح نئی تاریخیت کے علمبردار لوگ مختلف فنی ،سماجی، سیاسی مباحث کو وسیع النظری کے ساتھ موضوعِ گفتگو بناتے ہیں تاکہ قارئین اپنی تصوراتی اور حقیقی دنیا کے بارے میں غور وفکر کر سکیں۔

نیا تاریخی نظریہ فوکو کے Archeology کے تصور سے ماخوذ ہے جس میں فن کار کے تصورات کا زمان ومکاں سے گہرے تعلق کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخ ایک Archive کی حیثیت رکھتی ہے نیز ہر نظریے یا تصور کے مختلف مباحث اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اہم سمجھے جاتے ہیں تاہم حالات وحوادث کے بموجب جب اس کا تصور ٹوٹ جاتا ہے تو نئی تاریخیت اس کی از سرنو بازیافت کرتی ہے اور اس سے متعلق مختلف نظریات کے مابین رابطہ قائم کرتی ہے ۔ اربابِ ادب کے مطابق اس میں مختلف مباحث بالکل اسی طرح شامل ہوتے ہیں جس طرح کتب خانے کے اسٹاک میں ہر قسم کی کتابیں شامل ہوتی ہیں۔فوکو کے نزدیک تاریخ کا ہر نظریہ کسی خاص بحث کو پیش کرتا ہے جس کے زمان ومکاں کے تقاضے دیگر متون پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

Montrose کے مطابق ہر علم کسی خاص پس منظر کو پیش کرتا ہے جس کے دائرہ کار کی کوئی نہ کوئی حد ضرور ہوتی ہے ۔نئی تاریخیت حالات وحوادث کے تحت کسی نظریے کے تسلسل کے ٹوٹنے کی نشاندہی تو کرتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ ان مباحث کو بھی پیش کرتی ہے جو اس کی بقا کو مستحکم بناتے ہیں۔یعنی یہ کھوئے ہوئے وجود کی تلاش کرتی ہے۔اس کی مثال Paul Klee کے Angelus Novus کے کسی Angel سے دی جا سکتی ہے جس کے بارے میں Benjamine لکھتا ہے کہ وہ ماضی کے دریچوں کی طرف نگاہ کئے ہوئے مستقبل کی جستجو میں برسرِ عمل رہتا ہے۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کی طرف توجہ دینے سے مستقبل کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔

Benjamine جو Historical Materialism کو پیش کرتا ہے اس کے نزدیک:

A historical materialism can not do without the notion of present which is not a transition but in which time stands still and has come to a stop.For this notion defines the present in which he himself is writing history.Historicism gives the eternal image of the past.

(Ryan..p.49)

مندرجہ بالا سطور سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ کوئی بھی تاریخی نظریہ موجودہ صورتِ حال کے بغیر پیش نہیں کیا جا سکتا۔تاریخیت ماضی کی آفاقیت کو پیش کرتی ہے۔اس کے علاوہ نئی تاریخیت کو نئی تنقید کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا جہاں متن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔تاریخ ادبی مطالعات کی تحقیق کرتی ہے ۔یعنی متن اور تاریخ دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں جو باہم ایک نیٹ ورک کی حیثیت رکھتے ہیں۔متن کی تاریخیت اور متن کی زبان۔

نئی تاریخیت کے مطابق ہر تاریخی متن دوسرے متون کا موجب بنتا ہے اور زبان تاریخیت کے سیاق کو تہذیبی عناصر کے ساتھ پیش کرتی ہے ۔مزید برآں مادی مسائل اور اس کے اسباب کی نشاندہی متن سے ہو جاتی ہے ۔ نئی تاریخیت تین میدانوں میں تحقیقی کام انجام دیتی ہے۔مثلاً ادیب کی سوانح کا مطالعہ۔کسی متن میں سماجی حالات کی نشاندہی اور ان ضوابط کی پاسداری جو اس وقت رائج تھے۔متن میں کسی تخلیق کے سماجی حالات کی جھلک ۔ساتھ ہی ساتھ تاریخ اور متن میں شامل تضادات کو واضح کرنا۔ اس ضمن میں نئی تاریخیت کی مندرجہ ذیل مثالوں کو مدّنظر رکھنا ضروری ہے۔مثلاً

Renaissance نشاۃ ثانیہ کی تخلیقات کی از سرِ نو بازیافت اور عہدِ نو میں اس کی معنویت تلاش کرنا۔ مثال کے طور پر Twefth Night اور Lyrical Ballad کی تعبیر وتشریح کے ذریعہ شاعری پر ان میں پیش کردہ زاویوں کے ممکنہ اطلاق کو واضح کیا گیا۔اس کے علاوہ فن کار کے معاشی حالات کو پیش کرنے والے متعدد سانیٹ سماجی ،سیاسی اور تاریخی سیاق کو پیش کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ نئی تاریخی تنقید متن کی بنیادوں کو استوار کرتے ہوئے معاشرتی مقاصد کی ترجمانی کرتی ہے۔

Paul Brown نے The Tempest کے مطالعے پر توجہ دیتے ہوئے مادی حقائق اور جمالیاتی پہلوؤں کے امتزاج کے بجائے اس متن میں سماجی تنازعات کو تلاش کیا۔ اس نے Contemporary Colonial System کی آئیڈیالوجی کو موجودہ نظام کے کرداروں کی خصوصیت اور سماجی حیثیت کو واضح کیا۔اس میں Prospero کی اصول پسندی اور Caliban کی غلامانہ حیثیت جس میں حیوانیت بھی شامل ہے اپنی معنویت کو اجاگر کرتی ہے۔

Brown نے ان کرداروں کی تعبیر وتشریح کے ذریعہ یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ Caliban ان

تمام Colonial discourses of exuality masterlessness and savagism خصوصیات کا حامل ہے جن کے سبب موجودہ دور میں مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ادب میں موضوعِ گفتگو بنتے ہیں۔

اسی طرح Barker نے Shakespeare کی آردن سیریز اور Midsammer Tourism، Stanford Avon کے ذریعہ اس کی سماجی اقدار اور اس کے پس منظر کو پیش کیا۔ اس نے بین المتونیت Intertextuality کے تصور کے ذریعہ Prospero, Ariel Cliban اور Miranda کی گفتگو کو تاریخی شکل دی۔

راقم الحروف نے ان مثالوں کو اسی لئے شامل کیا ہے کہ اربابِ ادب نے ان کرداروں کی تخلیق میں جس احتجاجی رویہ کی نشاندہی کی ہے اس کا تذکرہ شیکسپیر کی تخلیقات میں شاذ و نادر ہی کہیں ملتا ہے۔ نئی تاریخیت کا حامل Greenblatt رقمطراز ہے:

The new historoicism obviously has distinct affinities withresonance that it is concern with literary text s has been to recover as far as possible the historical circumstances of their original production and assumption and to analyze the relationship between the circumstances and our own.

نئی تاریخیت یہ سوالات اٹھاتی ہے کہ کوئی بھی تخلیق حقائق کو کس حد تک صحیح انداز میں پیش کرتی ہے یعنی یہ خالصتاً معروضیت پر زور دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظریہ ادبی متون کی افہام و تفہیم میں تاریخی سیاق کو مدِّنظر رکھتا ہے۔ اس تصور کے تحت ناقدین نے تاریخی دستاویزات اور معاشی رکارڈ اور کیٹلاگ پر توجہ دی۔ نئی تاریخیت اقتدار، استعداد، سرکولیشن، حدود متعین کرنے اور متن کی زبان، سیاق، اور آئیڈیالوجی کے تحت کام کرتی ہے۔ اس نظریے نے نئی تنقید کے اس نظریہ کو چیلینج کیا جس کے تحت فن کار اور متن کو خود مختاری حاصل تھی۔ نئی تاریخیت کے تحت فن کار اپنے گرد و پیش سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات کے تئیں حسّاس ہوتا ہے جہاں تک اردو ادب میں نئی تاریخیت کا تعلق ہے تو پروفیسر شارب ردولوی کے تاریخی تنقید سے متعلق نظریے کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

'کسی عہد کے تقاضوں کی بنیادی کشاکش، مذہبی تصورات، معاشی حالات اور طبقاتی کشمکش کے اثرات کا نام 'روحِ اثر' ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں تاریخیت یا Historicity کہہ سکتے ہیں۔ ایک فن کار اپنے عہد کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی کشاکش سے اپنے کو الگ نہیں رکھ سکتا۔ لاکھ کوشش کے باوجود اس کے ذہن اور شعور عصریت اپنا عکس رکھتی ہے۔'

(ص۔304-305 جدید تنقید اصول اور نظریات)

تاہم ان کے بقول تاریخی مطالعہ،

'ایک بہتر مطالعے کے لئے مواد تو ضرور فراہم کرتا ہے لیکن اگر اس میں توازن باقی نہ رہے تو ناقد کی ساری توجہ تاریخی حقیقتوں، ماحول کے تجزیے اور ان سے فن کار کے خارجی طور پر متاثر ہونے پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے فن کار کی انفرادیت اور تخلیقی صلاحیت کی طرف توجہ نہیں ہو پاتی۔'

(ص۔314 جدید تنقید اصول اور نظریات)

پروفیسر عتیق اللہ کا مضمون اس ضمن میں نہایت اہمیت کا حامل ہے جس میں ان کے نزدیک:

'نو تاریخیت قرأت کا ایک خاص طریقہ ہے جس کا اصرار متن کے ایک غائر مطالعے پر ہے۔ نو تاریخیت یہ بتاتی ہے کہ کسی بھی فن پارہ کو کس طرح پڑھنا چاہئے اور دیگر متون جیسے اقتصادیات طبی دستاویزات اور قانونی کتابچوں وغیرہ کے متنی سیاقات کی روشنی میں اس کی تفہیم کیسے کی جاسکتی ہے۔'

وہ مزید لکھتے ہیں:

'نو تاریخیت اس رشتے پر بھی غور کرتی ہے جو ادبی متن اور اس کے تہذیبی نظام کے مابین قائم ہے۔ کئی سماجی، مذہبی، اخلاقی اقدار ایسی ہیں جنہوں نے مسلمہ اصول وضوابط کے تحت تشکیل پائی ہے اور یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ اکثر متون ان ہی مسلمات کے پیدا کردہ ہیں چوں کہ یہ متون خاص جبر کے تحت واقع ہوتے ہیں۔'

(ص۔420 تنقیدی جمالیات جلد پنجم)

ان کے نزدیک متنی سیاق کو نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ آیا اس کا تعلق کس پس منظر اور شعبے سے ہے اور وہ کن عوامل کے تحت وجود میں آئے ہیں۔

یعنی اربابِ ادب کے مطابق نئی تاریخیت سے ادبی اور غیر ادبی متون میں کثیر الجہتی اور بین العلومی مطالعے کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ ہندوستانی ادبیات میں اروندھتی رائے کی کتاب The God of Small Thing جسے Booker Prize ملا تھا۔ فوکو اور رشدی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے جس میں ان کا سوانحی پس منظر دکھائی دیتا ہے۔

جہاں تک اردو ادب میں اس نظریہ کا تعلق تو آزادی تخلیقی سطح پر قرۃ العین حیدر قاضی عبدالستار کے یہاں اس نظریہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تحقیقی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ میر شناسی میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ہندوستانی کلاسیکیت کی بازیافت کی اور میر کے متعلق متعدد غلطیوں کو دور کیا۔ ان کی نظر میں

’کلاسیکی غزل کی شعریات یقیناً ہے (یہ اور بات ہے کہ وہ ہم سے کھوگئی ہے یا چھن گئی ہے) اگر شعریات نہ ہوتی تو شعر بھی نہ ہوتا۔اور اس کی بازیافت اس لئے ضروری ہے کہ فن پارے کی مکمل فہم وتحسین اسی وقت ممکن ہے جب ہم اس شعریات سے واقف ہوں جس کی رو سے وہ فن پارہ بامعنی ہوتا ہے اور جس کے (شعوری یا غیر شعوری) احساس وآگہی کی روشنی میں فن پارہ بنایا گیا ہے۔اس بات میں تو شاید ہی کسی کو کلام نہ ہو کہ فن پارہ کسی تہذیب کا مظہر ہوتا ہے اور تہذیب کے کسی بھی مظہر کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے اور نہ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جب تک کہ ہمیں ان اقدار کا علم نہ ہو جو اس تہذیب میں جاری اور ساری تھیں۔فن پارے کی حد تک وہ تہذیبی اقدار اس شعریات میں ہوتی ہیں (یعنی ان اصولوں اور تصورات میں ہوتی ہیں جن کی پابندی کرنے یا کلام Discourse میں جن کو رائج کرنے سے Discourse کو اس تہذیب میں فن پارے کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔‘

(ص۔19 شعر شور انگیز جلد اول)

اس طرح شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر شور انگیز میں میر کے کلام سے متعلق نہ صرف مروجہ اور اغلاط کو درست کیا بلکہ کلاسیکی غزل کی شعریات کی از سرنو بازیافت کا کا انجام دیا ہے۔

محمد حسن کے یہاں بھی اس قسم کی مثالیں جا بجا نظر آتی ہیں بالخصوص دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر اس ضمن میں اہم پیش رفت سمجھی جا سکتی ہے۔ان کے نزدیک:

’ہر دور کا ادب عصری تقاضوں کا عکاس ہوتا ہے اور اسی لئے اس کے آئینے میں کسی ملک اور قوم کے ’درد وداغ وجستجو وآرزو‘ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔وہ سماج کا پروردہ بھی ہوتا ہے اور اس کا خالق بھی اور اسی لئے ادب کا مطالعہ وسیع تر تہذیبی پس منظر میں کرنا ضروری ہے، ادب کے ذریعے تاریخ کی جیتی جاگتی تصویر اور عہدِ ماضی کے کردار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔مختلف سماجی علوم کی مدد سے کسی مخصوص عہد کے مطالعے سے یہ راز بھی منکشف ہوسکتا ہے کہ اس دور میں چند تصورات کے ابھرنا اور چند عقائد واقدار کے نمایاں ہونے کے اسباب کیا تھے؟ گویا ادب کے کیا اور کیوں کا جواب تہذیبی تاریخ کی مدد سے ہی فراہم کیا جا سکتا ہے اور اس ضمن میں نسلی وراثت، معاشرت اور اس کے اقدار، معتقدات اور فلسفے، تاریخ اور سیاست کے ہنگامے، اقتصادیات کے پیچ در پیچ کے اثرات سبھی کا مطالعہ معاون ثابت ہوتا ہے۔‘

(ص۔14 دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر)

اس طرح محمد حسن کے یہاں بھی نو تاریخیت کے تصورات اور بین العلومی مطالعے کی اہمیت کے ساتھ موجودہ دور کے نظریات کی عکاسی اور ان کے امکانات کا وسیع تصور جا بجا نظر آتا ہے۔ان کی دیگر تصانیف قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ہندی ادب کی تاریخ اس ضمن میں اہم ہیں۔نو تاریخیت کو عملی طور پر مستحکم بنانے میں ان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نئی مارکسیت: جہاں تک نئی مارکسیت کا تعلق ہے یہ مارکس کے اصول اور اس کے افکار وخیالات کی وضاحت کرتے ہوئے عالمی منظر نامے پر اس کے اثرات اور تعلق کی وضاحت کرتی ہے بالکل اسی طرح کہ جس طرح مارکسی نظریہ سرمایہ داری کے خلاف جنگ کا اعلان کرتا رہا ہے۔ نئی مارکسیت اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں طبقاتی نظام رائج ہے اور وہاں سٹیلائٹ کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔یعنی ان کے نزدیک سٹیلائیٹ استحصال کا شکار ہیں۔نئی مارکسیت میں لوئی آلتھو کا نظریہ نہایت اہم ہے اس نے اپنی کتاب For Marks میں مارکس کے اصولوں پر اس کے نظریات سے بحث کی ہے اور یہ خیال بھی پیش کیا ہے کہ مارکسیوں نے داس کیپٹل کا اس طرح جائزہ نہیں لیا جیسا کہ انہیں لینا چاہئے تھا۔اس کی نظر میں سوسائٹی کے تمام امور کو سیاست، ثقافت اور معیشت کے ساتھ دیکھنا ضروری ہے اس کے Letter on Art میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ سائنس اور آرٹ دونوں کی آئیڈیالوجی مختلف ہے تاہم ثقافت ان میں رابطہ قائم کرتی ہے۔وہ آرٹ اور آئیڈیالوجی کے فاصلے کو قبول کرتے ہوئے سماج کی تعمیر پر زور دیتا ہے۔اس کا نظریہ نئی مارکسیت میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔بعد ازاں فریڈرک جیمس کا نظریہ جو 1970 میں منظرِ عام پر آیا، وہ نئی تاریخیت کے زیرِ اثر متن کی تعبیر وتشہیر کی بات کرتا ہے۔وہ سماج میں عوامی ثقافت اور فلم سے مرتب ہونے والے اثرات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس سے پیدا ہونے والے متضاد پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتا ہے جسے اس کی کتاب The Cultural Logic of Late Capitalism میں دیکھا جا سکتا ہے اس نے ویڈیو text کے بارے میں ایک مضمون لکھا جس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ وہ ٹیلی ویژن اور فلم کی کامرشیل صورتوں کو فنی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے۔اس نے ویڈیو متن کو آرٹ کی سطح پر لا کر انہیں موجودہ تہذیب کا حصہ قرار دیا۔

نئی مارکسی تنقید میں Raymond Williams کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس نے ڈرامے میں Ibsen سے لیکر بریخت تک جدید المیے modern tragedy کی روایات کو پیش کیا۔ انگریزی ناول ڈکنس سے لے کر لارنس کی روایات اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ دیہات اور شہروں میں رونما ہونے والے تہذیبی انقلاب کی نظریاتی بحث کی۔اس نے قدیم وجدید روایات کے امتیاز کو پیش کرتے ہوئے

یہ وضاحت کی کہ اس دور میں کسی ملک پر فتحیاب ہونے کا مطلب تھا barbarism یا بربریت مگر اب کسی ملک پر اقتدار کا مطلب ہے اسے ترقی سے ہمکنار کرنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئے وسیع النظر زاویہ نگاہ کو تاریخی ترقی سے تعبیر کرتا ہے۔اور اسے Historical Rationality of Enlightenment سے تعبیر کرتا ہے۔اس کے نزدیک:

Man had made their own history ,in this special sense :that they(or some of them)had achieved civilization. This process was secular and developmental.Page 13-14

(Marxism and Literature)

اردو ادب میں مارکسی نقطہ نظر کا آغاز باضابطہ طور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہوا بعد ازاں زمانہ اور حالات کے بدلتے رجحانات کے تحت اس کی فکر پر مارکسزم کا غلبہ کم ہو گیا تھا۔ یہ نظریہ آج بھی اردو تنقید میں آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے علمبردار ناقدین نے اس کے تصور کو نئی سمت عطا کی ہے۔آج بھی اردو تنقید کے مثبت اور تعمیری رویوں کو ترقی پسند نقطہ نظر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں احتشام حسین، ممتاز حسین ،علی سردار جعفری، محمد حسن، شارب ردولوی، سید عقیل رضوی اور احمد فاطمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس ضمن میں دوسری جانب مابعد جدیت کے علمبرداروں میں جہاں گوپی چند نارنگ کا نام سرِ فہرست ہے۔ان میں وہ ناقدین بھی شامل ہیں جنہوں نے مابعد جدیت کے اثر کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اردو میں اس کی تعبیر وتشریح پیش کی۔ان میں وہاب اشرفی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق اللہ، قاضی افضال حسین، پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور ناصر عباس نیر قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے اس کے پہلو بہ پہلو دیگر رجحانات کا اثر بھی قبول کیا۔ پروفیسر شارب ردولوی کا یہ اقتباس ترقی پسندی اور مابعد جدیت کے مابین توازن کو جس طرح پیش کیا ہے، اسے نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

'موجودہ عہد میں ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت کے نظریات میں شدت پسندی کم ہو چکی ہے اور بعض نظریات میں دونوں میں قربت اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔دراصل اختلاف تعبیر متن میں تھا اور دوسرا سماجی تعبیرات پر زور دیتا تھا۔ایک کا سارا زور لسانی مباحث اور لسانی تعبیر پر تھا اور دوسرا سماجی تغیرات پر زور دیتا تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ ہر شعر سماجی تعبیر رکھتا ہو۔، بنیادی تصور یہ تھا کہ شاعری یا ادب کے Sociological مطالعے سے ہی ہم اس عہد اور اس عہد کی شاعری سمجھ سکتے ہیں۔لیکن اس کے اظہار کے فنی حسن، بلاغتِ کلام اور شعری جمالیات کو نظر انداز کرنا نہیں تھا'

(ص۔10 ترقی پسند شعری فکر اور اردو شعرا)

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ عندیہ ملتا ہے کہ موجودہ دور میں اردو تنقید میں مختلف نظریات میں سے کسی بھی نظریہ کے استرداد کا رجحان نہیں ملتا بلکہ ہر تصور کے تعمیری پہلوؤں کو کثیر الجہتی تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔یہاں تک کہ اردو تنقید کا قاری موجودہ دور میں خود اپنے طور متن کی تعبیرات اور تشریحات کی پیش کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔

نو تاریخیت اور نئی مارکسیت کے تھ ساتھ ابھرنے والے تہذیبی مادیت کے نظریے کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔اس کی ابتدا انگلینڈ میں Raymond Williams کے پیش کردہ تصور Structure of feeling سے ہوئی۔اس ضمن میں پروفیسر عتیق اللہ کا یہ اقتباس نہایت اہم ہے:

'نو تاریخیت کے بالمقابل تہذیبی مادیت کی کارکردگی سیاست بیز ہے۔وہ تاریخی نقادوں کے طور پر تاریخی سیاق وسباق کو ایک خاص درجہ مہیا کرتی ہے۔اس کا طریق رسائی نظری بنیادوں پر قائم ہے نیز متنی تجزیہ کاری میں سیاسی وابستگی اس کا اصل الاصل ہے۔یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تہذیبی مادیت تاریخ نگاری کی ایک سیاست بیز شکل ہے، تہذیبی مادیت ہی نے تہذیب کے محضر وایتی اعلیٰ اور بلند کوش کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی بجائے اس کے اس مقبول عام کلچر کو بھی ایک خاص معنی فراہم کئے جو تہذیب کی کلیت میں گہری جڑیں بنا چکا ہے۔'

(ص۔425 تنقید کی جمالیات جلد پنجم)

اس طرح نئی تاریخیت کے تصور کے ساتھ ساتھ مارکسیت اور تہذیبی مادیت کے تصرف پر غور کرنا ضروری ہے جو نہ صرف ادب عالیہ بلکہ عوامی ادب میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

جہاں تک نئی تاریخیت اور نئی مارکسیت کا تعلق ہے تو یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور دونوں ہی حقیقت شناسی پر زور دیتی ہیں۔ جہاں انگریزی تنقید پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہوئے ہیں نظر آتے ہیں وہاں اردو پر بھی ان رجحانات کا اطلاق ہوسکتا ہے تاہم اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مشرق ومغرب کی سیاسی، سماجی، مذہبی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی اقدار و روایات اور ان کی مماثلتوں اور امتیازات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف رجحانات ونظریات کے تحت فنی اقدار کا تعین ضروری ہے۔مشرق پر مغربی زاویوں کو نہ تو مسلط کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی یکسر استرداد کا نظریہ اردو تنقید میں مثبت سمت اور امکانات کو وضع کرسکتا ہے۔دونوں کے امتیازات کو متوازن انداز میں سمجھنے سے ہی کسی بھی نظریۂ نقد کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔

❑❑❑

دبستان لکھنؤ: کل اور آج

محی بخش قادری

6/48

ونیت کھنڈ

گومتی نگر، لکھنؤ

رابطہ: 9839018959

پس منظر

دبستان لکھنؤ سے مراد شعر و ادب کا وہ رنگ ہے جو لکھنؤ کے شعرائے متقدمین نے اختیار کیا اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ رنگ قدیم اردو شاعری اور دہلوی شاعری سے مختلف ہے۔ جب لکھنؤ مرجع اہل دانش و حکمت بنا تو اس سے پہلے علم و ادب کے دو بڑے مرکز دہلی اور دکن شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لیکن جب دہلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو دہلی کے اہل علم و فضل نے دہلی کی گلیوں کو چھوڑنا شروع کیا جس کی وجہ سے فیض آباد اور لکھنؤ میں علم و ادب کی محفلوں نے فروغ پایا۔ لکھنؤ کو اردو شعر و ادب کا مرکز کہنا غلط نہیں ہے کیونکہ 300 برس پرانے لکھنؤ اسکول نے شاعری کو شادابی عطا کی۔ میرؔ کی غزل سوداؔ کے قصیدے، نسیمؔ کی مثنوی اور انیسؔ کے مرثیے وہ خوبصورت بوٹے تھے جو اس گلزار لکھنؤ میں مہکے تھے۔

سال ۱۷۰۷ء اورنگ زیب عالمگیر کی موت کے بعد مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اُن کے جانشین اپنے تخت کے لئے خود لڑنے لگے۔ ان نااہل حکمرانوں کی وجہ سے مرکز مزید کمزور ہوا اور باقی کسر مرہٹوں، جاٹوں اور نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کر دی۔ سال ۱۷۲۲ء میں بادشاہ دہلی نے سعادت علی خان کو اودھ کا صوبیدار مقرر کیا۔ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلد ہی سعادت علی خان نے خود مختاری حاصل کر لی اور اودھ کی خوشحالی کے لئے بھرپور جدوجہد کی جس کی بنا پر اودھ میں مال و دولت کی فراوانی ہوئی۔ صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے اودھ کی آمدنی میں مزید اضافہ کیا اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کوششیں کیں۔ آصف الدولہ نے مزید اس کام کو آگے بڑھایا۔ لیکن دوسری طرف دہلی میں حالات مزید خراب ہوتے گئے۔ امن و سکون ختم ہو گیا۔ تو وہاں کے ادباء و شعراء نے دہلی چھوڑنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اور بہت سے شاعر لکھنؤ میں جا کر آباد ہوئے۔ جن میں میر تقی میرؔ بھی شامل تھے۔

دولت کی فراوانی، امن و امان اور سلطنت کے استحکام کی وجہ سے اودھ کے حکمران عیش و نشاط اور رنگ رلیوں کے دلدادہ ہو گئے۔ شجاع الدولہ نے محل میں بے شمار عورتوں کو داخل کیا۔ حکمرانوں کی پیروی امراء نے بھی کی اور وہ بھی اسی رنگ میں رنگتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بازاری عورتیں ہر گلی کوچے میں پھیل گئیں۔ غازی الدین حیدر اور نصیر اور نصیر الدین حیدر نے اباء و اجداد کی پیروی جاری رکھی اور واجد علی شاہ نے تو اس میدان

میں سب کو مات دیدی۔ سلاطین کی عیش پسندی اور پست مذاقی نے طوائف کو معاشرے کا اہم جز بنا دیا۔ طوائفوں کے کوٹھے تہذیب ومعاشرت کے نمونے قرار پائے جہاں بچوں کو شائستگی اور آداب محفل سکھانے کے لئے بھیجا جانے لگا۔

شعروادب پر اثرات

عیش ونشاط، امن وامان اور شان وشوکت کے اس ماحول میں فنون نے بہت ترقی کی۔ راگ رنگ اور رقص وسرور کے علاوہ شعروشاعری کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ دہلی کی بے امنی اور انتشار پر اہل علم وفن اودھ اور خاص کر لکھنؤ میں اکٹھا ہونا شروع ہوگئے۔ یوں شاعری کا مرکز دہلی کی بجائے لکھنؤ میں قائم ہوا۔ دربار کی سرپرستی نے شاعری کی ایک عام ماحول پیدا کردیا۔ جس کی وجہ سے شعروشاعری کا چرچا اتنا پھیلا کہ جابجا مشاعرے ہونے لگے۔ امراء، رؤساء اور عوام سب مشاعروں کے دیوانے تھے۔ ابتدا میں شعرائے دہلی کے اثر کی وجہ سے زبان کا اثر نمایاں رہا لیکن آہستہ آہستہ اس میں کمی آنے لگی۔ مصحفی اور انشاء کے عہد تک تو دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری اور لکھنؤ کی خارجیت اور رعایتِ لفظی ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ لکھنؤ کی اپنی خاص زبان اور لب ولہجہ بھی نمایاں ہوتا گیا۔ اور یوں ایک نئے دبستان کی بنیاد پڑی جس نے اردو ادب کی تاریخ میں دبستان لکھنؤ کے نام سے ایک مستقل باب کی حیثیت اختیار کرلی۔

نمایاں خصوصیات

دبستان لکھنؤ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کی شاعری میں نشاطیہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔ یہ لکھنؤ کی پرامن زندگی اور خوشحالی کا عطیہ ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں عورت کے حسن کا بھرپور بیان ملتا ہے۔ اس کے زیور اور لباس کا ذکر جابجا نظر آتا ہے۔ لکھنوی شاعری میں تصوف کے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں کے رنگین ماحول میں نہ صوفیوں کا گزر تھا، نہ صبر وقناعت کی تعلیم کی ضرورت۔ دبستان لکھنؤ کی شاعری زبان کے نقطۂ نظر سے زیادہ دلکش اور پرکشش ہے۔ زبان کے سلسلے میں لکھنؤ والوں نے اہل دہلی سے اپنا راستہ الگ نکالا۔ شعرائے لکھنؤ جذبات سے زیادہ الفاظ کی نوک پلک نے اور زبان میں لطافت پیدا کرنے پر زور دیا۔ اس سے دبستان لکھنؤ کی زبان زیادہ دلآویز ہوگئی۔

نمائندہ شعراء

اودھ میں اردو شعروشاعری کی ابتدا باقاعدہ طور پر سراج الدین علی خاں آرزوؔ کی آمد کے بعد شروع ہوئی جنہیں نواب سالار جنگ نے جو شاعروں کے قدردان تھے دلّی سے فیض آباد سن 1754ء میں بلایا تھا۔ نمائندہ شاعر جو دہلی سے آئے تھے ان کی فہرست لمبی ہے۔ کچھ مخصوص شعراء کا تذکرہ نیچے دیا جارہا ہے۔

شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی (1751-1825)

مصحفی دہلی سے ہجرت کرکے لکھنؤ آئے۔ ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شعری مزاج دہلی میں صورت پزیر ہوا لیکن لکھنؤ کے ماحول، درباداری کے تقاضوں اور سب سے بڑھ کر انشاء سے مقابلوں نے انہیں لکھنوی طرز اپنانے پر مجبور کیا۔ ان کا منتخب کلام کسی بھی بڑے شاعر سے کم نہیں۔ اگر جذبات کی ترجمانی میں میر تک پہنچ جاتے تو جرأت اور انشاء کے مخصوص میدان میں بھی پیچھے نہیں رہتے۔ یوں دہلویت اور لکھنویت کے امتزاج نے شاعری میں شیرینی، نمکینی پیدا کردی ہے۔ ایک طرف جنسیت کا صحت مندانہ شعور ہے تو دوسری طرف تصوف اور اخلاقی مضامین بھی مل جاتے ہیں۔ لکھنوی شعراء کے سلسلے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی کی تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔

حسرت پہ اس مسافر بیکس کے روئیے
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے جی میں کیا کیا خیال باندھے
وہ جو ملتا نہیں ہم اس گلی میں دل کو
درودیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں
تیرے کوچے میں اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

سید انشاءاللہ خاں انشاء (1756-1817)

انشاء کے والدین دہلی سے مرشدآباد گئے جہاں انشاء کی ولادت ہوئی۔ انشاء کی ذہانت اور جدت پسندی انہیں اپنے ہم عصروں میں منفرد نہیں کرتی بلکہ تاریخ وادب میں بھی ممتاز مقام دلاتی ہے۔ غزل، ریختی، قصیدہ، اردو میں بے نقط دیوان ''رانی کیتکی کی کہانی'' جس میں عربی، فارسی کا ایک لفظ نہ آنے دیا۔ یہی نہیں انشاء پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے ''دریائے لطافت'' کے نام سے زبان وبیان کے قواعد پر روشنی ڈالی۔

انشاء نے غزل میں الفاظ کے متنوع استعمال سے تازگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ تاہم بعض اوقات محض قافیہ پیمائی اور ابتذال کا احساس ہوتا ہے۔ انشاء کی غزل کا عاشق لکھنوی تمدن کا نمائندہ وہ بانکا ہے جس نے بعد ازاں روایتی حیثیت اختیار کرلی۔ انہوں نے غزل میں مزاح کی ایک نئی بنیاد ڈالی۔ زبان میں دہلی کی گھلاوٹ برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

گرنازنیں کہے کا برا مانتے ہیں آپ
میری طرف بھی دیکھئے میں نازنیں سہی
لے کے اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں
روکھی پھیکی سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی
کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشاء
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

شیخ قلندر بخش جرأت (1749-1810)

جرأت دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کی شاعری کا مخصوص رنگ معاملہ بندی ہے۔جو دبستان دہلی کی اہم ترین خصوصیت ہے۔روایت ہے کہ شریف زادیوں سے آزادانہ میل ملاپ اور زنان خانوں میں بے جھجک جانے کے لئے خود کو اندھا مشہور کر دیا۔بہر حال نابینا ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔جرأت کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے جن میں بہت سے شاعر صاحب دیوان بھی ہیں۔ان کے ہاں محبوب کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ جیتی جاگتی اور ایسی چلبلی عورت کی تصویر ہے جو جنسیت کے بوجھ سے جلد جھک جاتی ہے۔اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جرأت کی غزل کی عورت خود لکھنؤ ہی کی عورت ہے۔زبان میں سادگی ہے اس لئے جنس کا بیان واضح اور دوٹوک قسم کا ہے۔ شاید اسی لئے حسن عسکری انہیں مزیدار شاعر سمجھتے ہیں۔

کل وقت راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کم بخت نے کیا مجھ پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم
گل لائے ہزاروں ہیں شجر اور ثمر بھی
کیجو کرم اے بادبہاری ٹک ادھر بھی
اس صید گرفتار کہ کیا کہئے کہ صیاد
سونپے ہے قفس میں جسے اور توڑے ہے پر بھی
گل ہائے ہزاروں ہیں شجر اور ثمر بھی
کیجو کرم اے باد بہاری ٹک ادھر بھی

خواجہ حیدر علی آتش (1778-1846)

آتش نے نہایت سادہ زندگی بسر کی۔طبیعت میں قناعت اور استغنا کا مادہ تھا۔انہوں نے کسی دربار سے تعلق پیدا نہ کیا اور نہ ہی کسی کی مدح میں کوئی قصیدہ کہا۔شاعری میں آتش اپنے نام کے مترادف آگ تھے۔آتش کی شاعری لکھنؤ میں پروان چڑھی مگر ایک دہلوی استاد مصحفی کے زیر سایہ، اس لئے دہلی اور لکھنؤ نے دبستانوں کی خصوصیت کا مزاج پیدا ہو گیا۔آتش ناسخ کے مد مقابل تھے۔ناقدین نے ناسخ پر ان کو فوقیت دیتے ہوئے لکھنؤ دبستان کا نمائندہ شاعر قرار دیا ہے۔ان کے اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔محاورات ایسے برمحل استعمال ہوتے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔آتش کا بھی نظریہ تھا۔

بندشِ الفاظ جڑنے میں نگوں سے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کے کلام کی اہم خصوصیات میں نشاطیہ انداز، صفائی اور محاورات کا بہترین استعمال ہے۔کہیں کہیں ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔انہوں نے روایتی شاعری سے ہٹ کر کیفیت و مردانگی و خودداری کے جذبات کو قلم بند کیا۔انہوں نے کسی شاہی دربار میں حاضری نہیں دی۔مولانا محمد علی جوہر نے لکھا ہے کہ ہندوستان نے صرف تین شاعر پیدا کئے ہیں۔ایک میر انیسؔ دوسرے میر تقی میرؔ، آدھے غالب اور آدھے آتش۔آتش مصحفی کے شاگرد تھے اور غزل کے استاد شاعر مانے جاتے ہیں۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرۂ خوں نہ نکلا
صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں
خدا یاد آ گیا مجھ کو بتوں کی بے نیازی سے
ملا بام حقیقت زینۂ عشق مجازی سے

اردو شاعری کے دلّی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے بیچ جو مقابلے ہوتے تھے اس کی تیاری استاد ناسخ اور آتش کے بیچ برابر ہوتی رہتی تھی۔ناسخ لکھنؤ اسکول کے استاد تھے مگر آتش ان کے شاگرد۔دیا شنکر نسیم بھی اس فن میں ماہر تھے۔

شیخ امام بخش ناسخ (1772-1838)

ناسخ کی شاعری میں نہ تو جذبات و احساسات ہیں اور نہ ہی ان کی پیدا کردہ سادگی ملتی ہے۔ انہوں نے مشکل زمینوں، اَنمل قوافی اور طویل ردیفوں کے بل پر شاعری ہی نہ کی بلکہ استادی بھی تسلیم کرائی۔ آج ان کی اہمیت زبان کی صفائی پیدا کرنے اور متروکات کی باقاعدہ مہم چلانے کی وجہ سے ہے۔انہوں نے زبان و بیان کے قوانین کی خود پیروی ہی نہ کی بلکہ اپنے شاگردوں سے ان کی پابندی کرائی۔اصلاح زبان کے سلسلے میں اردو شاعری میں ناسخ کا نام ہمیشہ لیا جائے گا۔یوں اردو غزل کی زبان کو جھاڑ جھنکار سے پاک صاف کرنے والوں میں انہیں مستقبل اہمیت حاصل ہے۔لیکن صرف الفاظ کی بازیگری شاعری نہیں ہوتی۔ان کے ہاں جذبے کا فقدان ہے۔مولوی عبدالحق ان کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ناسخ بلا شبہ ایک اچھے اور پاکیزہ طرز کا ناسخ اور ایک بھونڈے طرز کے موجد ہیں۔ان کے کلام میں نہ نمکینی ہے نہ شیرینی۔''

ان کی شاعری کے نمونے دیکھیں۔

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا
رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے کوئی
دل ہی دل میں ہم اسے یاد کیا کرتے ہیں
زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں
تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تیری تصویر لئے پھرتے ہیں

اگرچہ لکھنوی شاعری پر براہ راست میرؔ کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا لیکن ناسخ کے مشہور مصرعہ ''آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں'' سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ والے عام طور پر میر کی استادی تسلیم کرتے تھے۔

خصوصیات:

اکثر و بیشتر نقادوں نے دبستان لکھنؤ کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دلّی کے مقابلے میں لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت کا عنصر نمایاں ہے۔ واردات قلبی اور جذبات واحساسات کی ترجمانی اور بیان کی بجائے شعرائے لکھنؤ کا زیادہ زور محبوب کے لوازم ظاہری اور متعلقات خارجی کے بیان پر ہے۔ دوسری بات یہ کہ لکھنوی شاعری کا دوسرا اہم عنصر نسائیت ہے۔ اس کے علاوہ معاملہ بندی، رعایت لفظی، صنعت گری اور تکلفات پر زیادہ زور ہے۔ ذیل میں ہم اس کا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

خارجیت:

دلّی کی شاعری کے مقابلے میں لکھنؤ کی شاعری فکر اور فلسفے سے بالکل خالی ہے۔ نتیجتاً اس میں گہرائی مفقود ہے۔ اور ظاہرداری پر زور ہے۔ دروں بینی موجود نہیں۔ سوز و گداز کی شدید کمی ہے۔ خارجیت اور بیروں بینی کے مختلف مظاہر البتہ نمایاں ہیں لکھنؤ کی شاعری میں واردات قلبی کے بجائے سراپا نگاری پر زور ہے۔ ان کی شعری خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

''لکھنویت تکلف اور تصنع کا دوسرا نام ہے۔ جہاں شاعر محسوسات اور واردات کی سچی دنیا کو چھوڑ کر خیال کی بنی ہوئی رنگین فکر کی پیدا کی ہوئی پر پیچ راہوں پر چل کر خوش ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ لکھنؤ کی ساری زندگی میں ظاہر پر اس قدر زور تھا کہ شعراء کو دروں بینی کی مہلت ہی نہیں ملی۔ ان کی نظروں کے سامنے اتنے مناظر تھے کہ ان کے دیکھنے سے انہیں فرصت ہی نہیں ملی تھی۔

ایسے میں دل کی کھڑکی کھول کر میر کی طرح اپنی ذات کے اندر کون جھانکتا۔ جب انہوں نے عیش و عشرت اور آرائش و زیبائش کی محفلوں سے فرصت نہیں تھی۔

دیکھی شب وصل ناف اس کی
روشن ہوئی چشم آرزو کی

.....

کتنا شفاف ہے تمہارا پیٹ
صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ
بوسہ لیتی ہے تیرے پالے کی مچھلی اے صنم
ہے ہمارے دل میں عالم ماہیٔ بے آب کا
روشن یہ ہے کہ سبز کنول میں ہے سبز شمع
دھانی لباس پہنے جو وہ سبز رنگ ہے

مضمون آفرینی:

دبستان لکھنؤ کی شاعری کی دوسری نمایاں خصوصیت مضمون آفرینی ہے۔ مضمون آفرینی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر روایتی مضامین میں سے نئے مبالغہ آمیز اور عجیب و غریب پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ ایسے مضامین کی بنیاد جذبے کی بجائے تخیل یا واہمے پر ہوتی ہے۔ شعراء لکھنؤ نے اس میدان میں بھی اپنی مہارت اور کمال دکھانے کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

گلبرگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ
بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر
چشم بددور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف
سبزہ خط کیا غزال چشم کا چارہ ہوا
اس نے پونچھا پسینہ روئے عالمتاب کا
بن گیا رومال کونہ چادر مہتاب کا

معاملہ بندی:

سراپا نگاری اور مضمون آفرینی کے علاوہ دبستان لکھنؤ کی شاعری کی ایک اور خصوصیت جس کی نشان دہی نقادوں نے کی ہے وہ معاملہ بندی ہے۔ چونکہ دلّی کی تباہی کے وقت لکھنؤ پرامن تھا، دولت کی ریل پیل تھی، لوگ خوشحال اور فارغ البال تھے۔ بادشاہت امراء، وزراء اور عوام الناس تک سب عیش وعشرت میں مبتلا تھے۔ خصوصاً طوائف کو اس ماحول میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ ماحول کے اثرات شاعری پر بھی پڑے جس کی وجہ سے بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت جو دہلوی شاعری کا امتیازی نشان تھی یہاں عنقا ہوگئی۔ اس کی جگہ ایک نئے فن نے لے لی جس کا نام معاملہ بندی ہے۔ جس میں عاشق اور معشوق کے درمیان پیش آنے والے واقعات پردہ دروں کو کھول کر بیان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ایسے اشعار خال خال دہلوی شعراء کے ہاں بھی موجود ہیں اور یہ بات بھی درست ہے کہ اس فن میں جرأت پیش پیش تھے جو دلّی سے آئے تھے۔ لیکن لکھنؤ کا ماحول ان کو بہت راس آیا۔ چنانچہ ان کے ساتھ لکھنؤ کے دیگر شعراء نے جی بھر کر اپنے پست جذبات کو نظم کیا۔ ان کی گل افشانی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

کھولئے شوق سے بند انگیا کے
لیٹ کر ساتھ نہ شرمایئے آپ
کل وقت راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم
کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت
منہ گال پہ رکھنے سے خفا ہوتے ہو ناحق
مس کرنے سے قرآں کی فضیلت نہیں جاتی
تلخ بادام کا منھ میں مرے آتا ہے مزہ
چشم کا بوسہ جو وہ ہوکے خفا دیتا ہے

رعایت لفظی:

دبستان لکھنؤ کی ایک اور خصوصیت رعایت لفظی بتائی جاتی ہے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا لکھتے ہیں:

''لکھنؤ کا معاشرہ خوش مزاج، مجلس آراء اور

فارغ البال لوگوں کا معاشرہ تھا۔ مجلس زندگی کی جان لفظی رعایتیں ہوتی ہیں۔ مجلسوں میں مقبول وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں زبان پر پوری قدرت ہو اور لفظ کا لفظ سے تعلق اور لفظ کا معنی سے رشتہ پوری طرح سمجھتے ہوں۔ لفظی رعایتیں محفل میں تفریح کا ذریعہ ہوتی ہیں اور طنز کو گوارا بناتی ہیں۔ لکھنؤ میں لفظی رعایتوں کا ازحد شوق تھا۔ خواص وعوام دونوں اس کے بہت شائق تھے۔ رؤوساء امراء تک بندیاں کرنے والوں کو باقاعدہ ملازم رکھا کرتے تھے۔ ان ہی اسباب کی بناء پر لکھنوی شاعری میں رعایت لفظی کی بہتات ہے اور لفظی رعایتیں اکثر مفہوم پر غالب آجاتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات محض لفظی رعایت کو منظوم کرنے کے لئے شعر کہا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر:

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہوں باغباں
لالہ کا پھول رکھنا امانت کی گور پر

غسل کرکے یہیں دریا میں نہانے کو نہ جا
مچھلیاں لپٹیں گی اے یار ترے بازو سے

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

طویل غزلیں:

لکھنوی شاعری کی ایک اور نمایاں بات طویل غزلیں ہیں۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ ابتداء جرأت مصحفی نے کی جو دلّی دبستان سے تعلق رکھتے تھے اور جو دلّی کی تباہی کے بعد لکھنؤ جا بسے تھے۔ لیکن لکھنوی شعراء نے اس کو زیادہ پھیلایا اور بڑھایا اور اکثر لکھنوی شعراء کے ہاں طویل غزلیں بلکہ دوغزلہ اور سہ غزلہ کے نمونے ملتے ہیں (محمد حسین کی آب حیات میں یہ طویل غزلیں دیکھی جاسکتی ہیں)۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے اس دور میں پرگوئی اور بدیہہ گوئی کو فن قرار دے دیا گیا تھا۔ نیز لوگ قافیہ پیمائی کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے طویل غزلیں بھی لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ 31-52 اشعار پر مشتمل غزلیں تو اکثر ملتی ہیں۔ بلکہ بقول ڈاکٹر خواجہ زکریا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ طویل غزلیں بھی لکھی جاتی تھیں۔

قافیہ پیمائی:

طویل غزل سے غزل کو فائدے کی بجائے یہ نقصان ہوا کہ بھرتی کے اشعار غزل میں کثرت سے شامل ہونے لگے۔ شعراء نے زور کلام دکھانے کے لئے لمبی ردیفیں اختیار کرنی شروع کردیں جس سے اردو غزل میں غیر مستعمل قافیوں اور بے میل ردیفوں کا رواج شروع ہوا۔ معمولی قافیوں اور ردیفوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس نے قافیہ پیمائی کا رواج شروع ہوا۔ ذیل میں بے میل ردیفوں سے قافیوں کی چند مثالیں درج ہیں:

انتہائی لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہئے

لگی غلیل سے ابرو کی، دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسے ہی کہ لگے جیسے تڑ سے زاغ کو چوٹ

بات طویل غزلوں اور بے میل ردیفوں اور قافیوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ شعراء لکھنؤ نے اپنی قادرالکلامی اور استادی کا ثبوت دینے کے لئے سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی۔

پیچ دار تشبیہ اور استعارے کا استعمال:

اگرچہ تشبیہ اور استعارے کا استعمال ہر شاعر کرتا ہے لیکن یہ چیز اس وقت اچھی معلوم ہوتی ہے جب حد اعتدال کے اندر ہو۔ شعراء دلّی کے ہاں بھی اس کا استعمال ہوا لیکن لکھنؤ والوں نے اپنی رنگین مزاجی کی بدولت تشبیہوں کا خوب استعمال کیا اور ان میں بہت اضافہ کیا۔ محسن کاکوروی، میر انیس، نسیم، دبیر نے پرکیف، عالمانہ اور خوبصورت تشبیہیں برتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی شعراء صرف تشبیہ برائے تشبیہ بھی لے آئے ہیں جس سے کلام بے لطف اور بے مزہ ہوجاتا ہے۔

سبزہ ہے کنارے آب جو پر
یا خضر ہے مستعد وضو پر

محو تکبرِ فاختہ ہے
قد و قامت سرو دلربا ہے

کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہے
اور آب رواں طواف میں ہے

ساقی کی مست آنکھ پہ دل ٹوٹ جاتے ہیں
شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے

آگیا وہ شجر حسن نظر جب ہم کو
بوسے لے کے لب شیریں کے چھوارے توڑے

مستی میں زلف یار کی جب لہرا گئی
بوتل کا منہ ہمیں دہن مار ہو گیا

نسائیت:

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھنوی دبستان کی شاعری کا ایک اہم عنصر نسائیت بتایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ہر زمانے ہر قصہ اور ہر زبان میں عورت شاعری کا بڑا اہم موضوع رہا ہے۔ لیکن لکھنؤ کی سوسائٹی میں عورت کو اہم مقام حاصل ہوگیا تھا۔ اس نے ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اگر یہ عورتیں پاک دامن اور عفت ماب ہوتیں تو سوسائٹی اور ادب دونوں پر ان کا صحت منداثر پڑتا لیکن یہ عورتیں بازاری تھیں۔ جو صرف نفس حیوانی کو مسسل کرتی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف عیش وعشرت اور فراغت نے مردوں کو مردانہ خصائل سے محروم کرکے ان کے مردانہ جذبات وخیالات کو کمزور کردیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آگئی۔ چنانچہ ریختہ کے جواب میں ریختی تصنیف ہوئی۔ اس کا سہرا عام طور پر سعادت یار خاں رنگین کے سر باندھا جاتا ہے۔ رنگین کے بعد انشاء اور دوسرے شعراء نے بھی اسے پروان چڑھایا۔ ان شعراء کے ہاں ریختی کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں عورتوں کے فاحشانہ جذبات کو ان کے خاص محاوروں میں جس طرح

ان لوگوں نے نظم کیا ہے وہ لکھنؤ کی شاعری اور سوسائٹی کے دامن پر نہ مٹنے والا داغ بن کر رہ گیا ہے۔

سوز و گداز:

اس ساری بحث سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ لکھنوی شعراء کے ہاں اعلیٰ درجہ کی ایسی شاعری موجود نہیں جو ان کے سوز و گداز جذبات اور احساسات اور واردات قلبیہ کی ترجمان ہو۔ تمام نقادوں نے اس بات کی تائید کی ہے بلکہ عندلیب شادانی جنہوں نے لکھنوی شاعری کے خراب پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ نمایاں کر کے پیش کیا ہے وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شعرائے لکھنؤ کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ ایسے نمونے ناسخ اور آتش کے علاوہ امانت اور رند وغیرہ کے ہاں سب سے زیادہ ملتے ہیں۔ یہاں اس بات کے ثبوت میں مختلف شعراء کے کلام سے کچھ مثالیں پیش ہیں:

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتا ہے جگر ناسخ تیری فریاد سے

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

بتوں کے عشق میں کیا جی کو اضطراب دیا
یہ دل دیا کہ خدا نے مجھے عذاب دیا

دل نے شب فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا
مونس اسے کہتے ہیں غم خوار اسے کہتے ہیں

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

ہم اسیروں کو قفس میں بھی ذرا چین نہیں
روز دھڑکا ہے کہ اب کون رہا ہوتا ہے

حرم کو اس لیے اٹھ کر نہ بتکدے سے گئے
خدا کہے گا کہ جو رہ بتاں اٹھا نہ سکا

مجموعی جائزہ:

اردو ادب میں دونوں دبستانوں کی اپنے حوالے سے ایک خاص اہمیت ہے۔ دبستان لکھنؤ نے موضوعات کی بجائے زبان کے حوالے سے اردو ادب کی بہت خدمت کی اور ناسخ کی اصلاح زبان کی تحریک نے اردو زبان کو قواعد و ضوابط کے حوالے سے

> ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھنوی دبستان کی شاعری کا ایک ہم عنصر نسائیت بتایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ہر زمانے ہر قصہ اور ہر زبان میں عورت شاعری کا بڑا اہم موضوع رہا ہے۔ لیکن لکھنؤ کی سوسائٹی میں عورت کو اہم مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اس نے ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اگر یہ عورتیں پاک دامن اور عفت ماب ہوتیں تو سوسائٹی اور ادب دونوں پر ان کا صحت مند اثر پڑتا لیکن یہ عورتیں بازاری تھیں۔ جو صرف نفس حیوانی کو مسلسل کرتی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف عیش و عشرت اور فراغت نے مردوں کو مردانہ خصائل سے محروم کر کے ان کے مردانہ جذبات و خیالات کو کمزور کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آ گئی۔ چنانچہ ریختہ کے جواب میں ریختی تصنیف ہوئی۔ اس کا سہرا عام طور پر سعادت یار خاں رنگین کے سر باندھا جاتا ہے۔

بہت زیادہ ترقی دی۔ جبکہ دبستان لکھنؤ کا اثر دہلی کے آخری دور کے شعراء غالب، مومن، ذوق پر بھی نمایاں ہے۔ دبستان لکھنؤ کے آخری شاعر کے روپ میں سراج لکھنوی (1894-1968) کا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن بعضے تسنیم فاروقی (وفات 2010) کو آخری شاعر شمار کرتے ہیں۔ اگر موجودہ لکھنؤ کے شعراء کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو آج تمام تر تبدیلیوں کے باوجود شعراء کے یہ دعوے صادق نظر آتے ہیں۔

کمال فن کا ہنر گفتگو میں باقی ہے
سخن کا رمز ابھی لکھنؤ میں باقی ہے
انیس اشفاق

تغیرات زمانہ کے بعد بھی رحمت
زبان و فن میں نمایاں ہے لکھنؤ اب تک
رحمت لکھنوی

چلو کہہ دو ہواؤں سے سنبھل کے
بھرا رکھا ہے ساغر چشم تر کا
عمر انصاری

تشنگی کے بھی مقامات ہیں کیا کیا یعنی
کبھی دریا نہیں کافی کبھی قطرہ بھی بہت ہے
کرشن بہاری نور

پھول سے معصوم بچوں کی زباں ہو جائیں گے
مٹ بھی جائیں گے تو ہم اک داستاں ہو جائیں گے
والی آسی

اک زہر سا قسطوں میں اترتا ہے رگوں میں
سب حادثے اک ساتھ گزر کیوں نہیں جاتے
اشعر علیگ

ماضی قریب اور موجودہ لکھنوی شعراء میں اگر نمائندہ شعرا کی (مشکوک شعراء کو چھوڑ کر) فہرست تیار کی جائے تو ان میں سعید اختر نظامی، تسنیم فاروقی، مشتاق لکھنوی، کرشن بہاری نور، انیس اشفاق، کمال لکھنوی، سنجے مصر اشوق، مخمور کاکوروی، عمر انصاری، والی آسی، ظفر شہیدی، اشعر علیگ، تجسس اعجازی، فاروق جاذب لکھنوی، رباب رشیدی، بشیر فاروقی، رشید قریشی، نسیم نکہت، رحمت لکھنوی، فیاض لکھنوی، سرور نواب، سلطان عالم سرور لکھنوی، عرفان لکھنوی، ڈاکٹر ہارون رشید، سجاد لکھنوی، منظر لکھنوی، ڈاکٹر مجرب لکھنوی، طیب کاظمی، حسن فراز، برق لکھنوی، عشرت رضوی، فاضل لکھنوی، بلال کاظمی، یاور لکھنوی، عتیق لکھنوی، جاوید برقی وغیرہ کے ناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

□□□

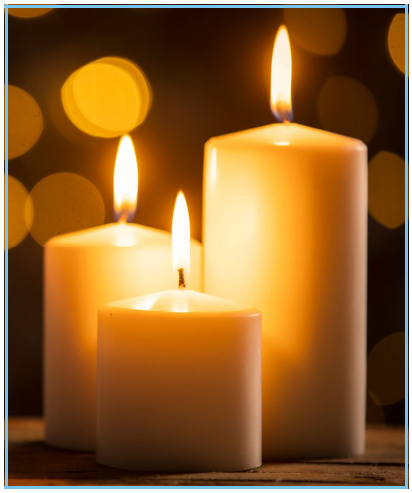

ماہنامہ شمع ادب: ایک نظر میں

ڈاکٹر نیاز سلطانپوری

بھٹی جرولی

پوسٹ کٹاواں

سلطانپور

رابطہ: 8756228058

حصولِ آزادی کے بعد تقسیم ملک کے ردّعمل میں شمالی ہندوستان میں اردو پر پیغمبری وقت آن پڑا، آزادی سے قبل جن لوگوں کی مادری زبان اُردو تھی اور جو اپنے خیالات کا اظہار اس ہر دل عزیز ہندوستان کی مشترکہ قومی وسرکاری زبان میں کرتے تھے وہی آنِ واحد میں اُردو کی مخالفت میں اُتر آئے اور اُسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے لگے۔ تعلیمی اداروں سے اردو کا اخراج ہوا۔ چشم زدن میں اردو میڈیم اسکولوں کو ہندی میڈیم اسکولوں میں تبدیل کر دیا گیا اور لسانی عصبیت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اُردو کے پرستاروں کو ایسے ماحول میں خاموش رہنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نظر نہ آیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری سرپرستی نہ ہونے کے باوجود اُردو کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہی۔ انھیں حالات میں بڑے بڑے شہروں میں بھی اردو اخباروں اور رسائل کی کمی محسوس کی جانے لگی۔ چنانچہ محبانِ اردو کے ایما پر مشرقی اتر پردیش کے نہایت پسماندہ شہر سلطانپور سے سید توکل حسین نیّر سلطانپوری کی ادارت میں ماہنامہ ’شمعِ ادب‘ جاری ہوا جو تقریباً بارہ برس تک آسمانِ صحافت پر ضیا پاشیاں کر کے روپوش ہو گیا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن اردو ماہناموں نے اردو زبان وادب کو فروغ دینے اور قارئین کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اُن میں سرزمینِ سلطانپور اودھ سے شائع ہونے والے ادبی ماہنامہ ’’شمعِ ادب‘‘ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

ماہنامہ شمع ادب جولائی ۱۹۵۹ء میں سید توکل حسین نیّر سلطانپوری ایم،اے کی زیرادارت نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۷۲ء تک شائع ہوتا رہا۔ شمارہ نمبر ۱۲، ۱۹۷۲ء شمع ادب کا آخری شمارہ شائع ہونے کے بعد اشاعت سلسلہ بند ہو گیا۔ شمع ادب شروع شروع میں لالہ رام سمرن لال سریواستو پرنٹر وپبلیشر کی زیرنگرانی سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے طبع ہو کر لکھنؤ نا کہ سلطانپور سے شائع ہوتا تھا بعد میں پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے نیّر صاحب اسے دفتر ماہنامہ شمع ادب لکھنؤ روڈ سلطان پور سے شائع کرنے لگے۔ معاونین میں بابوا جودھیا پرشاد شریواستو صاحب ذیج جیوڈیشئل افسر، پنڈت گوکل پرشاد پاٹھک صاحب ساحر ایڈوکیٹ، بابو بانکے بہاری سنگھ ایڈوکیٹ، جناب عبدالحئی خاں صاحب کامل وکیل اور جناب محمد اسحاق خاں صاحب رئیس موضع پارہ تحصیل مسافرخانہ سلطانپور کے اسمائے گرامی تھے۔ یہ رسالہ حضرت فراق گورکھپوری کے زیر سرپرستی، انجمن شمع ادب سلطانپور کے زیراہتمام جاری ہوا۔

رسالے کے اجراء کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے نیر سلطانپوری نے اپنے افتتاحیہ اداریہ میں لکھا ہے:

'سلطانپور کی سرزمین ویسے تو شعر و شاعری کے لئے کافی مردم خیز رہی ہے لیکن کسی ادبی رسالے کا اجراء آج تک اس کی تاریخ میں نہیں ہوا۔ یہ ہمارے ادبی سرگرمیوں کا پہلا بیج ہے جس کو جناب ذبیح صاحب کی بلند مذاقی اور ادب نوازی نے میدان عمل میں بویا اور حضرت فراق گورکھپوری کی سرپرستی اس کے نشوونما کی ضامن ہوئی۔ اب رہا اس کی آبیاری کا کام! یہ ارباب ذوق کی قدردانی پر منحصر ہے۔ شاعروں کے نغمے جو آج تک صدا بصحرا ہو جایا کرتے تھے، اب محفوظ کئے جاسکیں گے۔ ادبی جواہر ریزے جو آج تک پردۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے اب منظر عام پر لائے جاسکیں گے۔ اسی طرح ہمارے تمدن اور ہماری نوزائیدہ قومیت کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا کافی موقع مل سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس نوعیت کی یہ پہلی شمع ہے جو دنیائے ادب میں روشن کی جارہی ہے۔ اگر آپ کی عنایتیں اور مہربانیاں شامل حال ہو جائیں تو اس کی ضو عالمگیر بھی بن سکتی ہے۔

ہم یہ بھی تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایسے نازک دور میں شمع ادب کا اجراء بڑی جرأت مندی کا کام ہے۔ لیکن ارباب ذوق کی بے غرض سرگرمیوں کو کیا کہا جائے جن کی بدولت تصور معرض وجود میں آ ہی گیا۔ عرصہ سے یاران طریقت اس کے منتظر تھے، تاخیر کے شکوے، التوا کی شکایتیں اب تک تو میں سر آنکھوں پر رکھتا رہا لیکن اب آپ کی قدردانی اور خلوص کا امتحان ہے۔

یہ ماہنامہ کسی غیر معمولی مقصد کے ماتحت نہیں شائع کیا جارہا ہے صرف شاعروں اور ادیبوں کی خدمت ہمارا نقطۂ نظر ہے۔ اس ماہنامہ میں ادبی انجمنیں اپنی کارگزاریوں کی مکمل رپورٹ، شعراء کا کلام اور مقالے وغیرہ بلا تکلف شائع کرا سکتی ہیں۔ یہ ماہنامہ تمام ادبی انجمنوں کا مکمل ترجمان بن کر آپ کے سامنے آرہا ہے۔ ہمارے بعض قابل قدر شعراء جو مالی دشواریوں کی بنا پر اپنا مجموعہ نہیں شائع کرا سکتے ہیں، وہ محض تعاون عمل کے عوض اپنے نام کا مخصوص نمبر شائع کرا سکتے ہیں۔ بہترین نظموں، غزلوں، مقالوں اور مختصر افسانوں پر معاوضہ کے لئے بھی ایک خاص رقم رکھی گئی ہے۔ جیسے جیسے ہمارے دامن میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی، یہ رقم بھی بڑھتی جائے گی۔ نثر میں ایسے مضامین بھی شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے جو فن شاعری سے متعلق ہوں گے۔

پھر بھی اس سے ہمارا مقصد دولت جمع کرنا نہیں ہے بلکہ دولت تقسیم کرنا ہے۔ اگر آپ دامے درمے قدمے سخنے ہماری مدد کرتے رہیں گے تو ہمیں اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔'

(شمع ادب، جولائی ۱۹۵۹ء، ص ۲)

غلام احمد عرفان اعظمی شاگرد جناب منیف اعظمی نے شمع ادب کی قطعہ تاریخ کہی:

کر رہا ہے ملک میں کس شان سے
خدمت اردو زباں شمع ادب
سرپرستی اس کی کرتے ہیں فراق
کیوں نہ ہو فخر زماں شمع ادب
اس کے حامی ہیں ذبیح نامور
ہے یہ مقبول جہاں شمع ادب
بن کے چمکے گا وطن میں ایک دن
نیرؔ ہندوستاں شمع ادب
ہند میں جاری رہے گا تا ابد
صورت جوئے رواں شمع ادب
فکر مجھ کو بھی ہوئی تاریخ کی
آ گیا جب ناگہاں شمع ادب
از سر آئین عرفاںؔ لکھ دیا
گنج گوہر ضوفشاں شمع ادب

۱۹۵۹ء

نیّر صاحب ممتاز شاعر کے ساتھ ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے تاحیات وہ اردو زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔ اُردو، اُن کا اوڑھنا بچھونا تھی اور وہ اُس کے مستقبل کے بارے میں ہمہ وقت متفکر رہا کرتے تھے چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ اُردو کے قتل کا دور ہے۔ اِس دور میں اُردو کو زندہ رکھنے کی ہر ترکیب پر عمل کرنا ہوگا..... اُردو کے خونِ ناحق کا بیڑہ سبھوں نے اُٹھایا ہے..... مگر کیا یہ سعیِ قتل کامیاب ہوئی؟ نہیں۔ یہ نہ ہوئی اور نہ ہوگی اس لیے کہ زبان اگر واقعی زندہ زبان ہے تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس کے قاتلوں نے خود ہی اپنی گردنیں کاٹ لی ہیں۔ وار تو اس زبان پر بھی بیس برس سے ہو رہے ہیں مگر اِس کو کیا کیا جائے کہ کبھی تلوار کی دھار ہی مڑ جاتی ہے اور کبھی تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑتی ہے جب کوئی قاتل اس کے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو ملک کی تمام جماعتیں اِس قاتل کی مذمت کرنے لگتی ہیں..... یونیورسٹیوں میں دو چار لڑکوں کے لیے اُردو کے پروفیسر رکھنے سے خلوص دل کا اظہار نہ ہو سکے گا، آج جو بھی ابتدائی اسکول کے تعلیمی ڈھانچے پہ نظر دوڑائے گا وہ کانگریس کی عصبیت اور ہٹ دھرمی اور اُردو دشمنی کو بے نقاب پائے گا مگر ہمیں بددل نہ ہونا چاہیے۔

(شمع ادب جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۲، ص: ۳)

نیّر صاحب کا مقصد ابتداء ہی سے ادبی وثقافتی گروہ بندیوں سے اوپر اٹھ کر فنکاروں کی صلاحیتوں کو ابھارنا تھا جو اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود گروہ بندیوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ پائے تھے چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''ہماری کوشش ابتدا ہی سے یہ رہی ہے کہ ہم ان ادبی گروہ بندیوں سے ہٹ کر فنکاروں کی

صلاحیتوں کو ابھارنے میں اپنے فرض سے کوتاہی نہ کریں جن کی اعلیٰ صلاحیتوں کو حلقہ بندیوں کی مشکل گزاریوں نے آگے بڑھنے سے روک دیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی ہمارے اِس مشن میں شریک ہوں گے کہ ہم نے دیانت داری کے ساتھ اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے میں کوئی پہلو تہی نہیں کی۔''

(شمع ادب غریق نمبر ص:۳)

نیّر صاحب نے متعدد گرانقدر نمبر بھی شائع کئے جن میں غریق سیتاپوری نمبر شفا گوالیاری نمبر، انجمن شمع ادب رانچی نمبر اور قلمی معاونین نمبر بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

۱۹۶۹ء میں غالبؔ صد سالہ تقریبات کے موقع پر انھوں نے غالبؔ کی شخصیت اور فن پر گرانقدر نمبر غالب نما شائع کر کے مشہور و معروف شاعر حضرت اسد اللہ خان غالبؔ دہلوی کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا جس کے اداریہ میں آپ نے غالب نما نمبر کی ضرورت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔

غالب صدی منانے کے سلسلہ میں ہند و پاکستان ہی کے ماہناموں نے نہیں بلکہ بیرونی ممالک کے رسالوں نے بھی نہایت شاندار اور خوبصورت غالب نمبر شائع کئے ہیں اور اردو ادب کے قدردانوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ بھی لیا ہے۔ اس ہمہ ہمی اور گہما گہمی کے دور میں غریب شمع ادب ہر ایک کا منھ تک رہا تھا کہ آخر دنیا کے اس مسلمہ اردو زبان کے شاعر اعظم کو شمع ادب کیسے خراج عقیدت پیش کرے۔ غالبؔ سے ہمیں جو کچھ خلوص ہے وہ خاموش بیٹھے رہنے کے بھی منافی تھا۔ چنانچہ بہت غور و فکر کے بعد یہ طے کیا گیا کہ غالب نمبر ضرور نکلے لیکن کوئی نیا نام دیا جائے تاکہ ملک کے غالب نمبروں سے مقابلہ کا کوئی سوال نہ رہے۔ غور و خوض کے بعد اس مخصوص شمارے کا نام غالب نما رکھا گیا اور پھر یہ کوشش کی گئی کہ غالب نما کو اس قدر جامع بنا دیا جائے کہ وہ غالب کی ادبی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر سکے۔ اب آپ کے ادارہ کی مخلصانہ کوششوں کا ماحصل آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

برصغیر ہندو پاک کی مقتدر ادبی شخصیتوں کی تخلیقات زیب قرطاس ہوئیں، اِس میں نیّر صاحب نے غالبؔ سے متعلق ایک طویل تصوراتی انٹرویو بھی شائع کیا جس میں انھوں نے سوالات کے جوابات خود ہی غالبؔ مرحوم کے اشعار سے دیئے ہیں اِس انٹرویو میں انھوں نے غالبؔ کی شخصیت اور فن سے متعلق تمام گوشوں کو اُجاگر کیا ہے، غالبؔ کے تئیں نیّر صاحب کا جو جھکاؤ تھا یہ انٹرویو اس کی نمایاں مثال ہے۔

بطور نمونہ نیر صاحب کے قائم کردہ سوالات اور دیوان غالب کی روشنی میں ان کے جوابات دئے گئے ہیں:

''جشن غالب کی خبریں پڑھتے پڑھتے رات ایسا ہوا کہ جب میں سو گیا تو مرزا اسد اللہ خاں غالب عالم رویا میں تشریف لائے اور میرے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ ان کی وہ لمبی سیاہ کلاہ دیکھ کر پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں نے مزاج پرسی کے بعد سگریٹ پیش کی۔ سگریٹ دیکھ کر مسکرائے اور حقہ کی فرمائش کی۔ میں نے فوراً حقہ تیار کرایا۔ سامنے لاکر رکھا گیا۔ پھر چائے آئی۔ مسکرا کر کہنے لگے۔ مجھے جو مرغوب ہے وہ پلاؤ۔ میں نے معذرت کی تو انہوں نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور گلاس میں ڈال کر دو گھونٹ پیئے۔ پھر حقہ کے کش لیتے ہوئے اردو زبان اور سیاست حاضرہ پر کچھ دیر باتیں کیں۔ میں نے ساحرؔ لدھیانوی کی نظم سنائی۔ بہت خوش ہوئے۔

میں نے عرض کی حضور! میں آپ کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ بڑی زور سے ہنسے، کہا: یہ انٹرویو کیا ہے؟ میں نے کہا کہ کچھ سوالات آپ سے کئے جائیں گے۔ آپ ان کے جوابات دیں گے۔ بس یہی انٹرویو ہے۔ بولے، پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ میں نے بکمال عاجزی گزارش کی کہ آپ شاعر اعظم ہیں۔ آپ کے کلام کا لوہا دنیا تب نہیں تو اب مانتی ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا:

شہرتم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

پھر میں نے بصد ادب استدعا کی۔ حضور والا! میری یہ ادنیٰ سی خواہش ہے کہ آپ میرے سوالوں کے جوابات اپنے ہی اشعار سے دیں۔ ایک گھونٹ گلاس سے پی کر بولے: مضائقہ نیست۔ پوچھو کیا پوچھتے ہو؟

سوال: معاف فرمایئے گا، آپ کی رنگت زرد کیوں ہے؟

جواب:

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

سوال: شراب حرام ہے تو آپ پیتے کیوں ہیں؟

جواب:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

سوال: کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ تنگ دستی کی وجہ سے آپ کا کوئی کام رک گیا؟

جواب:

اسکی الفت میں ہوں میں مرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبد بے در کھلا

سوال: آپ شراب کے مستقل عادی ہیں یا صرف عید بقرعید ہی پی لیتے ہیں؟

جواب:

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

سوال: شراب پینے سے آپ کو فائدہ کیا ہے؟

جواب:

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گہری ہی راس ہے

سوال: کیا آپ قرض کی بھی شراب پیتے تھے اور اگر پیتے تھے تو کیا انجام قرض پر نگاہ نہیں رکھتے تھے

جواب:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

سوال: آپ دہلی سے لکھنؤ کیوں آئے تھے

جواب:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

سوال: کیا لکھنؤ آنے کے بعد حج بیت اللہ کا بھی ارادہ کیا تھا؟

جواب:

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

سوال: آپ کس کی شاعری کے قائل ہیں:

جواب:

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

سوال: کیا آپ بڑی غور و فکر کے بعد شعر کہتے ہیں؟

جواب:

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

سوال: کیا آپ اردو کو فارسی سے بہتر پاتے ہیں؟

جواب:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

انٹرویو کے آخر میں لکھتے ہیں:

'میں نے کھڑے ہو کر دست بستہ گزارش کی کہ حضور والا! کچھ اور پوچھ سکتا ہوں۔ فرمانے لگے: اب وقت نہیں ہے۔ پھر آنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت مجھے معاف کرو۔ یہ کہتے ہوئے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور دیکھتے دیکھتے فضا میں گم ہو گئے۔

'اٹھئے زبس کہ لذت خواب سحر گئی'

میری بھی آنکھ کھل گئی اور دیر تک خواب کے مزے لیتا رہا اور مرزا کا یہ شعر پڑھتا رہا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے ز بس کہ لذت خواب سحر گئی''

ادارہ شمع ادب نے دسمبر 1964 میں 304 صفحات پر مشتمل مشہور و معروف شاعر حضرت شفاؔ گوالیاری کے فن و شخصیت پر ایک گرانقدر نمبر بھی شائع کیا۔ اس نمبر کی اشاعت کے سلسلہ میں نیّر صاحب لکھتے ہیں ''شمع ادب کا یہ گرانقدر شفاء نمبر گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ شفاء صاحب کی ہر دل عزیزی، شاعری میں ان کا مقام ان کی ادبی خدمات کا جائزہ ان کی شاعری کا رجحان غرض کہ اس سے ان تمام باتوں پر روشنی پڑتی ہے جس کی کسی فن کار کے مرتبے کو واضح کرنے میں ضرورت پڑتی ہے۔ ہند و پاک کے مشاہیر ادیب اور شعراء نے جس خلوص اور محبت کے ساتھ شفاء صاحب کے کلام پر تبصرہ کیا ہے وہ یقیناً ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نمبر اپنی گرانقدری اور افادیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ادب نواز حضرات کے ہاتھوں تک زیادہ سے زیادہ پہنچ سکے.....

آخر میں لکھتے ہیں:۔

شفا صاحب جس طرح شعری صلاحیت میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اسی طرح بحیثیت انسان بھی بے مثال ہیں ان کی زندگی میں بڑا بانکپن اور خودداری ہے۔ وہ ایک مخلص دوست کی حیثیت سے ملتے ہیں۔ صورت آشناء ہونے کے مقابلے میں دل آشناء ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انکی دوستی بے غرض اور ان کی محبت بے لوث ہے۔ ایسے دور میں جبکہ سچے انسان عنقا ہیں شفاء صاحب کی ذات گرامی بسا غنیمت ہے''۔

اس شمارے میں اس عہد کے تقریباً تمام ادباء اور شعراء نے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ بابائے اردو مولانا عبدالحق صاحب لکھتے ہیں۔

''شفاء صاحب حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم و مغفور کے شاگرد ہیں ان کے اشعار میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو مولانا سیماب کے یہاں ملتی ہیں۔ شفاء صاحب کی غزلوں میں کوئی فنی یا عروضی خامی غالباً نہ مل سکے گی۔ شفا صاحب نے غزل کے مزاج اور اس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ذیل میں چند اشعار ان کے رنگ سخن کا اندازہ کرنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔

اس درجہ بڑھ گئے ہیں خد بے خودی سے ہم
اب تو اسی کو پوچھ رہے ہیں اسی سے ہم

آسودگان عیش بتائیں وہ کیا کریں
جن کو بقدر حوصلہ غم بھی ملا نہ ہو

ہر کمال ایک زوال ہے یعنی
ہر بلندی دلیل پستی ہے

کس قدر بے رنگ ہے دنیا مری
جیسے میکش کی سحر ، زاہد کی شام

یہ تو مشقِ حیات ہے تیری
جینے والے کہاں حیات ابھی

نیّر صاحب نے گرئ محفل کے تحت طرحی پریس مشاعرہ کی روایت کو مستحکم بھی کیا جس میں تقریباً دو تین

شمع ادب میں شائع کی جانے والی تخلیقات کا اشاریہ ۱۹۵۹ تا ۱۹۷۲ء (مع ضروری وضاحت)

نمبر شمار	سن اشاعت	عنوان	مقالہ نگار
۱	جولائی ۱۹۵۹ء	پیغام	فراق گورکھپوری
۲	اگست ۱۹۵۹ء	پیرِ واکبرؔ (ایک تعارف)	امانت اللہ اسیر علی گڑھی
۳	نومبر ۱۹۵۹ء	اردو شاعری میں طنز و تعریض مومن کی امتیازی خصوصیات	پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ)
۴	دسمبر ۱۹۵۹ء	عشرت کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر	عیش سلطان پوری ایم۔اے۔ایل۔ٹی۔
۵	فروری ۱۹۶۰ء	ترقی پسند دور کا مایۂ ناز غزل گو جگر مرادآبادی	امانت اللہ اسیر علی گڑھ
۶	مئی ۱۹۶۰ء	قصہ گل بکاولی پر تحقیقی نظر	ایڈیٹر
۷	مئی ۱۹۶۰ء	آئینہ خانہ	فگار اناوی
۸	فروری ۱۹۶۰ء	غزل نما	پروفیسر احتشام حسین
۹	مارچ ۱۹۶۰ء	نواب جعفر علی خاں اثر کی شاعری	ڈاکٹر محمد حفیظ سید
۱۰	ایضاً	غزل اور اقبال	سید بشیر الحق پٹنہ
۱۱	ایضاً	عصمت چغتائی	مجنوں گورکھپوری
۱۲	اپریل ۱۹۶۰ء	فانی بدایونی	ایڈیٹر
۱۳	ایضاً	گل بکاولی کی حقیقت	ایضاً
۱۴	نومبر ۱۹۶۰ء	جگر کی شخصیت اور شاعری	سید معین الدین قادری
۱۵	دسمبر ۱۹۶۰ء	اخترؔ شیرانی کی شاعری کا دوسرا رخ	راہیؔ بلند شہری
۱۶	جنوری ۱۹۶۱ء	نقد و نظر	سید محمود نقوی کانپوری
۱۷	ایضاً	میر انیسؔ پر ایک سرسری نظر	اسماء شاہین
۱۸	فروری ۱۹۶۱ء	اقبال اور فرنگی	معین الدین قادری ایم۔اے۔
۱۹	مارچ ۱۹۶۱ء	گل کدۂ عزیز	اختر علوی بارہ بنکوی
۲۰	اپریل ۱۹۶۱ء	اردو تحریک	پروفیسر آل احمد سرور
۲۱	مئی ۱۹۶۱ء	جگر کی شاعری	کلیم فاروقی ایم۔اے۔الہ آباد

۲۲	ایضاً	آئینہ خانہ	فگار انّاوی
۲۳	جون ۱۹۶۱ء	اردو شاعری میں قطعہ و رباعی	سید محمود نقوی
۲۴	جولائی ۱۹۶۱ء	ساحرؔ اور تلخیاں	وحید فتح پوری
۲۵	اگست، ستمبر ۱۹۶۱ء	ٹیگورؔ خود اپنی نگاہ میں	سید معین الدین قادری
۲۶	ایضاً	علاّمہ اقبالؔ - ایک مطالعہ	کلیم فاروقی
۲۷	اکتوبر، نومبر ۱۹۶۱ء	علاّمہ صفیؔ لکھنوی (اقتباس)	مس نجمہ حسنین کانپوری
۲۸	ایضاً	حضرت نوح ناروی (سادگی و پرکاری)	ادارہ
۲۹	ایضاً	آبِ حیات اور تحقیق	محمد انصار اللہ نظر گورکھپوری
۳۰	ایضاً	اقبال کا فلسفہ اور ایشیائی تخیل	سید محمود نقوی
۳۱	دسمبر ۱۹۶۱ء	شفا گوالیاری	ادارہ
۳۲	ایضاً	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	سید معین الدین قادری
۳۳	ایضاً	نازک خیالی	محمد انصار اللہ نظر
۳۴	ایضاً	اخترؔ شیرانی (تعارفی خاکہ)	ادارہ
۳۵	ایضاً	انکشافِ حقیقت (تعارفی مقالہ)	مولوی نجم الدین
۳۶	ایضاً	بابو لال وحشت (تعارفی مقالہ)	ادارہ
۳۷	مارچ، اپریل ۱۹۶۲ء	جگر بریلوی	ادارہ
۳۸	ایضاً	بابائے اردو	اختر جہاں نقوی بی۔اے۔
۳۹	جون ۱۹۶۲ء	اردو شعر و ادب	محمد انصار اللہ نظر
۴۰	ایضاً	جوشؔ ملیح آبادی	ایضاً
۴۱	ایضاً	وحیدہ نسیم (تعارفی مقالہ)	نصیر کوٹی کراچی
۴۲	ایضاً	ظفر اور ذوق	محمد انصار اللہ نظر
۴۳	ایضاً	ادب اور زندگی	اکرم اعظمی
۴۴	جنوری، فروری ۱۹۶۲ء	رواں اور ان کی شاعری	چودھری پربھان شنکر سروش انّاوی
۴۵	ایضاً	واحد پریمی کی شاعری کے دورخ	قریشہ سلطانہ ادیب کامل علی گڑھ

۴۶	مارچ،اپریل ۱۹۶۲ء	اردو کا مستقبل ماضی کے آئینہ میں	محمد اکرم مئوناتھ بھنجن
۴۷	ایضاً	سینٹ مارک گرجا گھر	افضل النساء بیگم حیدرآباد
۴۸	ایضاً	جگر بریلوی بقلم خودنوشت (سوانح)	جگر بریلوی
۴۹	ایضاً	بابائے اردو مرحوم	اختر جہاں نقوی
۵۰	مئی ۱۹۶۲ء	اردو شعروادب عہد بہمن سے قطب شاہی تک	محمد انصار اللہ نظر
۵۱	ایضاً	شعلۂ رنگیں پر ایک نظر	عبدالحی خاں کامل وکیل
۵۲	جولائی ۱۹۶۲ء	مختصر سوانح حیات جناب بیدلؔ دہلوی	چودھری پربھان شنکر سروش انّاوی
۵۳	ایضاً	اقبال سہیل	علی جواد زیدی سری نگر
۵۴	ایضاً	مرزا عزیز بیگ	پروفیسر دلاور حسین خان ہندو یونیورسٹی بنارس
۵۵	اگست-ستمبر ۱۹۶۲ء	ملک کے مشہور شاعر حضرت شفا گوالیاری	سید محمود الحسینی ایڈیٹر ندیم بھوپال
۵۶	ایضاً	دلی سے لکھنؤ تک	محمد انصار اللہ نظر
۵۷	ایضاً	مخدوم میری نظر میں	راشد پیامی
۵۸	اکتوبر-نومبر ۱۹۶۲ء	میر قمرالدین منّت	محمد انصار اللہ نظر
۵۹	ایضاً	داغ کی شاعری میں غم کا تصور	نجم فاروقی
۶۰	ایضاً	اختر شیرانی	صغیرہ نسیم (دوگاواں لکھنؤ)
۶۱	ایضاً	پریم چند میدانِ عمل کی روشنی میں	محبوب الرحمن
۶۲	جلد نمبر ۴ ۱۹۶۳ء سال نامہ	جوش ملیح آبادی	محمد انصار اللہ نظر
۶۳	ایضاً	وحیدہ نسیم - تعارفی مقالہ	نصیر کوٹی کراچی
۶۴	مارچ،اپریل ۱۹۶۳ء خصوصی شمارہ	ظفر اور ذوق	محمد انصار اللہ نظر
۶۵	ایضاً	فلسفۂ جمالیات	صابر شاہ آبادی
۶۶	ایضاً	ادب اور زندگی	اکرم اعظمی
۶۷	مئی ۱۹۶۳ء خصوصی شمارہ	ادب اور سائنس	محی الدین قادری
۶۸	ایضاً	بالیشور ناتھ	ایڈیٹر
۶۹	ایضاً	تبصرہ برنوائے ادب بابت جولائی ۱۹۶۲ء اور اکتوبر ۱۹۶۲ء	جمال صدیقی

۷۰	جولائی ۱۹۶۳ء	کرشن چندر سے ایک ملاقات	شمیم حنفی
۷۱	ایضاً	جرم محمد آبادی شعلۂ رنگیں کی روشنی میں	ابرا حسنی
۷۲	ستمبر ۱۹۶۳ء	فانی حیدرآباد دکن میں	صدق جائسی
۷۳	ایضاً	انور پانی پتی	شہزاد انجم بی۔اے۔
۷۴	اکتوبر،نومبر ۱۹۶۳ء	چک بست اور نیچرل شاعری	کے۔یو۔خاں ایم۔اے۔
۷۵	دسمبر ۱۹۶۳ء	بہادر شاہ ظفر	ڈاکٹر قطب النساء بیگم ہاشمی حیدرآباد دکن
۷۶	سالنامہ ۱۹۶۴ء قلمی تعاون نمبر	مثنویوں کا تاثراتی پہلو	ڈاکٹر قطب النساء بیگم ہاشمی حیدرآباد دکن
۷۷	ایضاً	فیض اور دست صبا	وحید متین ایم۔اے۔بی۔ایس۔سی
۷۸	ایضاً	مشاعرہ اور اس کی ترویج واشاعت	ڈاکٹر سید محمد عقیل شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی
۷۹	ایضاً	تنقید کے مقصدی فرائض	صابر شاہ آبادی
۸۰	ایضاً	قلی قطب شاہ ایک جائزہ	شمیم حنفی ایم۔اے۔ریسرچ اسکالر الٰہ آباد یونیورسٹی
۸۱	ایضاً	غزل اور عصری تقاضے	بیتاب پیلی بھیتی یم کام علیگ
۸۲	ایضاً	کلامِ ناسخ میں متروک الفاظ	محمد انصار اللہ نظر
۸۳	ایضاً	خودی (اقبال کا نظریہ)	خلیل اللہ خاں (لکچرر گورنمنٹ پالیٹکنک گورکھپور)
۸۴	جلد نمبر ۶، اپریل، مئی ۱۹۶۴ء	رشید صاحب پر ایک نظر	وحید متین فتح پوری
۸۵	ایضاً	ترقی پسندی اور جذبی کا فن	محمد طٰہٰ صدیقی بستوی
۸۶	ایضاً	نبضِ دوراں	عنوان چشتی ایم۔اے۔آگرہ
۸۷	ایضاً	میرے دادا پنڈت برج نارائن چک بست	گوپال متل، مترجم: شمیم حنفی
۸۸	ایضاً	بہادر شاہ ظفر کے چند اہم مشاغل	سید احمد رضوی ریسرچ اسکالر شعبہ اردو الٰہ آباد
۸۹	جون ۱۹۶۴ء	قبول اور مطبوعاتِ اردو	محمد انصار اللہ نظر
۹۰	ایضاً	مقالاتِ تلہری	صابر شاہ آبادی
۹۱	ایضاً	مطلعِ وطن پر ایک نظر	نانک چند عشرت
۹۲	ایضاً	جسٹس آنند نرائن ملاّ سے ایک انٹرویو	فوقی کریمی علی گڑھ
۹۳	جولائی ۱۹۶۴ء	موجودہ طرز تنقید	صابر شاہ آبادی

۹۴	ایضاً	ذوق دہلوی میری نظر میں	عذرا بانو نکہت (مئوناتھ بھنجن)
۹۵	اگست ۱۹۶۴ء	تبصرہ ہندوستان کی پہلی منظوم تاریخ مطلعِ وطن	ایڈیٹر
۹۶	ایضاً	شاہ غلام اعظم افضل	محمد انصار اللہ نظر
۹۷	ایضاً	اختر انصاری	خلیل الرحمن انصاری
۹۸	ایضاً	اقبال ڈاکٹر سچد انند سنہا کی نظر میں	صابر شاہ آبادی
۹۹	ستمبر ۱۹۶۴ء	(تبصرہ) فہرست کتب خانہ گورکھپور یونیورسٹی	محمد انصار اللہ نظر
۱۰۰	ایضاً	(تبصرہ) سہ ماہی نخلستان اودے پور	ادارہ
۱۰۱	ایضاً	ضیاء پرتابگڑھی کی شاعری	وحید الدین احمد ایم۔اے۔(رانچی)
۱۰۲	دسمبر ۱۹۶۴ء شفا نمبر	اپنی زبان اپنا بیان	ڈاکٹر شفا گوالیاری
۱۰۳	ایضاً	نبض حیات	علاّمہ نیاز فتح پوری
۱۰۴	ایضاً	کچھ شفا گوالیاری سے متعلق	سید احتشام حسین
۱۰۵	ایضاً	شفا گوالیاری	شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی
۱۰۶	ایضاً	شفا گوالیاری کی نئی غزلیں (دیباچہ زخم گل)	ڈاکٹر شکیل الرحمن
۱۰۷	ایضاً	شفا گوالیاری کے سلسلے میں	ظؔ انصاری
۱۰۸	ایضاً	شفا گوالیاری نبض حیات کی روشنی میں	کوثر چاندپوری
۱۰۹	ایضاً	شفا گوالیاری کی شاعری	اختر رضوی علیگ
۱۱۰	ایضاً	آیاتِ شفا	ابوالفضل راز چاندپوری
۱۱۱	ایضاً	ڈاکٹر شفا گوالیاری اور بھوپال	ڈاکٹر سلیم حامد رضوی
۱۱۲	ایضاً	آیاتِ شفا سے زخم گل تک	ڈاکٹر سید حامد بھوپال
۱۱۳	ایضاً	شفا اور فن	ابر احسنی
۱۱۴	ایضاً	نبض حیات پر طائرانہ نظر	مولانا واجد الحسینی بھوپال
۱۱۵	ایضاً	شفا اور تصوف	مولانا رمزی ترمذی ایڈوکیٹ بھوپال
۱۱۶	ایضاً	شفا کی شخصیت اور ان کا فن	محمود الحسینی بھوپال
۱۱۷	ایضاً	شفا گوالیاری	ضیاء فتح آبادی (دہلی)

۱۱۸	ایضاً	ڈاکٹر شفا گوالیاری	جگناتھ آزاد
۱۱۹	ایضاً	غزلیاتِ شفا میں طنزیہ عنصر	مظفر حنفی ہنسوی
۱۲۰	ایضاً	شفا گوالیاری کی غزل گوئی اور قادرالکلامی	مولانا کوثر جائسی
۱۲۱	ایضاً	شفا کا پیام عالم انسانیت کے نام	نثار اٹاوی
۱۲۲	ایضاً	سادگی اور پرکاری	نشور واحدی
۱۲۳	ایضاً	ڈاکٹر شفا گوالیاری	احترام الدین
۱۲۴	ایضاً	لیلۃ الشفا	حبیب الرحمن غزنوی
۱۲۵	ایضاً	شفا گوالیاری کی قوت اصلاح	طرفہ قریشی
۱۲۶	ایضاً	شفا گوالیاری پر ایک طائرانہ نظر	محمد فیاض الدین احمد فیاض گوالیاری
۱۲۷	ایضاً	شفا فاتح تغزل	صابر شاہ آبادی
۱۲۸	ایضاً	شفا گوالیاری کی شاعری کا مثبت اور رجائی پہلو	پروفیسر عنوان چشتی
۱۲۹	ایضاً	رباعیاتِ شفا گوالیاری	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں خوش تر
۱۳۰	ایضاً	شفا گوالیاری	لطف اللہ خاں نجمی
۱۳۱	ایضاً	شفا صاحب کا خلوص	ذکری بھوپال
۱۳۲	ایضاً	شفا گوالیاری اپنی شاعری کے آئینے میں	قیصر مظہر حسین
۱۳۳	ایضاً	میرے بھائی شفا گوالیاری	اعجاز صدیقی
۱۳۴	ایضاً	گلدستۂ شفا	خواجہ شاہ ناصر خانونی
۱۳۵	ایضاً	شفا گوالیاری کے نثری فن پارے	جمال فاضلی
۱۳۶	جنوری ۱۹۶۶ء	ہندی اردو مسئلہ	رام لال
۱۳۷	مارچ ۱۹۶۶ء	علی سردار جعفری ایک ترقی پسند شاعر	پروفیسر سید احتشام حسین
۱۳۸	ایضاً	منیف اعظمی کی شخصیت اور کلام پر ایک طائرانہ نظر	شیام لال ورما مست الہ آبادی
۱۳۹	ایضاً	پریم چند اور اردو افسانے	ابوالفیض سحر بی۔اے۔عثمانیہ
۱۴۰	ایضاً	مشاعرہ اور شاعر	محمد زبیر صدیقی ایڈوکیٹ بلیا
۱۴۱	ایضاً	تاثیر شعر اور ہمارا ذہن	مہمی ناروی

۱۴۲	ایضاً	واحد پریمی-بھوپال کا ایک خوش فکر شاعر	خلیل املنیری
۱۴۳	جولائی ۱۹۶۶ء	علاّمہ اقبال پر ایک نظر	ضیاء الاسلام
۱۴۴	ایضاً	میر حسن کا تذکرہ شعراء اردو	محمود فاروقی
۱۴۵	ایضاً	دکن کا ایک عظیم شاعر توفیق مرحوم	انور کمال خوندمیری حیدرآباد
۱۴۶	ایضاً	کچھ اپنے متعلق	اثر قادری مینانگری
۱۴۷	ایضاً	اردو شاعری میں مطالعۂ فطرت کا طریقہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی
۱۴۸	ایضاً	ٹی۔ایس۔ایلیٹ کا نظریۂ شاعری	اندر سروپ سریواستوا
۱۴۹	ایضاً	حبیب احمد صدیقی شخصیت اور شاعری کے آئینہ میں	بیتاب پیلی بھیتی
۱۵۰	ایضاً	حسرت مجاہد حریت	پروفیسر عادل جعفری
۱۵۱	ایضاً	ادب میں ابہام	جیون لال گوہر
۱۵۲	اکتوبر، نومبر ۱۹۶۶ء	اردو غزل اور تہذیب	صابر شاہ آبادی
۱۵۳	دسمبر ۱۹۶۶ء	واسوخت امانت (دبستان لکھنؤ کی آخری دین)	مختار احمد مانی بریلوی
۱۵۴	ایضاً	سلیمان خمار باگلکوٹی	وفا اعظمی
۱۵۵	ایضاً	یادرفتگاں	حکیم عبدالاحد خاں ارمان مرحوم بھوپالی
۱۵۶	جنوری ۱۹۶۷ء خصوصی شمارہ غریق نمبر	غریق سیتاپوری	نادم سیتاپوری
۱۵۷	ایضاً	تذکرۂ میری حسن پر ایک نظر	ماخوذ
۱۵۸	ایضاً	میرے قطعات	خورشید افسر بسوانی
۱۵۹	ایضاً	راقم کانپوری اپنے کلام کے آئینے میں	ضمیر شاہ جہاں پوری
۱۶۰	ایضاً	کلام اقبال پر ایک نظر	حسنین صدیقی برن پور
۱۶۱	ایضاً	تبصرے (سنگ وسمن بھوپال میں غزل، اور سوز دروں اور ساز بےخودی، تین مسافر، مکاتیب وحشت پر تبصرے	ادارہ
۱۶۲	فروری، مارچ ۱۹۶۷ء	میر تقی میر ایک مطالعہ	فضل امام رضوی قدسی اعظمی
۱۶۳	ایضاً	عنوان چشتی اور ذوق جمال	سیدہ اختر
۱۶۴	ایضاً	عبدالحی خاں کامل - ایک انسان ایک شاعر	مجیب عزمی بی۔اے۔

۱۶۵	اپریل، مئی ۱۹۶۷ء	مہجور شمسی سے ایک انٹرویو	ضیاء الانجم پرتا بگڑھی
۱۶۶	ایضاً	نقد ونظر (تبصرہ جوقِ جمال) مجموعۂ کلام، عنوان چشتی	بیتاب پیلی بھیتی
۱۶۷	ایضاً	نسیم شاہ جہان پوری میری نظر میں	پیام فتح پوری ہمایوں باغ کانپور
۱۶۸	جون، جولائی ۱۹۶۷ء	اردو کی کس مپرسی	میلا رام وفا
۱۶۹	ایضاً	خرد پر ایک نظر	قمر غازی پوری
۱۷۰	ایضاً	موجِ نسیم (شاہ جہاں پوری) آبگینے اور وادی گل پر تبصرے	رمز سیتا پوری
۱۷۱	سالنامہ ۱۹۶۸ء	صہبائے سخن	حبیب احمد صدیقی
۱۷۲	ایضاً	تنگ نائے غزل	پروفیسر سلطان احمد صدیقی بیتاب پیلی بھیتی
۱۷۳	ایضاً	امجد حیدر آبادی	پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی
۱۷۴	ایضاً	شعر میں اصلیت	سلام سندیلوی
۱۷۵	ایضاً	توارد یا سرقہ	مناظر عاشق ہرگانوی
۱۷۶	ایضاً	اکبر کا انداز بیاں	پروفیسر عنوان چشتی
۱۷۷	ایضاً	غالبؔ، ذوقؔ کے ایک سیرت نگار کی نظر میں	نادم سیتا پوری
۱۷۸	جون ۱۹۶۸ء	کلامِ فیض (تنقیدی فنطاسی ایک تجزیہ)	اے۔ کے۔ جالب
۱۷۹	ایضاً	ہندوستان میں سرکاری زبان کا مسئلہ	سی راج گوپال آچاریہ
۱۸۰	ایضاً	ہمارے آئین کے بنیادی عناصر	تیج بہادر سنہا ایڈیٹر روہیل کھنڈ اخبار بریلی
۱۸۱	ایضاً	سلطان محمود غزنوی (تاریخی مقالہ)	ماخوذ از (ہفتہ وار) میقات دیوبند
۱۸۲	ایضاً	تبصرہ گل نو واحد پریمی	صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی
۱۸۳	خصوصی شمارہ نمبر ۱۰، ۱۱	سرقہ وتوارد	حافظ عباد اللہ فاروقی
۱۸۴	ایضاً	زندگی سے زندگی کی طرف (تبصرہ)	ادارہ
۱۸۵	ایضاً	گل نو پر ایک نظر (تبصرہ)	ایڈیٹر
۱۸۶	جلد نمبر ۸، ۹ شمارہ نمبر ۱۲ ۱۹۶۸ء	میر کی عالمگیر مقبولیت	فراق گورکھپوری
۱۸۷	ایضاً	سائنس اور انسانیت کا مستقبل	معین الدین قادری
۱۸۸	ایضاً	ناظم سلطان پوری ایک تعارف	ایڈیٹر

۱۸۹	نومبر، دسمبر ۱۹۶۸ء	تبصرہ بر کتاب کاروانِ ادب	یوسف جمال راج گانگ پور اڑیسہ
۱۹۰	ایضاً	نوح ناروی شخصیت کے آئینہ میں	افتخار احمد فہمی ناروی
۱۹۱	شمارہ نمبر ۳، ۱۹۶۹ء	گیت	ڈاکٹر اعجاز حسین
۱۹۲	ایضاً	اردو ادب پر زمانہ کی تبدیلیوں کا اثر	ڈاکٹر شارب ردولوی
۱۹۳	ایضاً	میر کا ادبی عہد	شایاں قدوائی
۱۹۴	ایضاً	ساحر ہوشیار پوری	شکیل احمد عاصم بریلوی
۱۹۵	جولائی ۱۹۶۹ء خصوصی شمارہ غالب نما	عظیم شاعر اور انسان دوست	پروفیسر صلیشف
۱۹۶	ایضاً	سوویت یونین میں غالب	بابان غفوروف
۱۹۷	ایضاً	غالب اپنے آبائی وطن میں	ڈاکٹر قمر رئیس
۱۹۸	ایضاً	غالب کی کہانی غالب کی زبانی (خطوط پر مبنی)	ادارہ
۱۹۹	ایضاً	مرزا غالب اور روس	پروفیسر سید احتشام حسین
۲۰۰	ایضاً	غالب عالم رؤیا میں	نیّر سلطان پوری
۲۰۱	ایضاً	غالب نما (مشاہیر اردو کی آراء)	ادارہ
۲۰۲	ایضاً	غالب کی ہمہ گیر مقبولیت کا سبب	فراق گورکھپوری
۲۰۳	ایضاً	خصوصیاتِ کلامِ غالب	بیتاب پیلی بھیتی
۲۰۴	ایضاً	غالب نثر کے آئینے میں	شکیل احمد عاصم بریلوی
۲۰۵	ایضاً	غالب سے انٹرویو	تاراشنکر ناشاد بریلوی
۲۰۶	ایضاً	نقش غالب و اقبال	فکری سلطان پوری
۲۰۷	ایضاً	غالب ایک اردو شاعر کی حیثیت سے	شایاں قدوائی
۲۰۸	ستمبر تا دسمبر ۱۹۶۹ء	غالب میری نظر میں	محمد اسماعیل آزاد ایڈوکیٹ
۲۰۹	ایضاً	جدید ادب کے غیر صحت مند رجحانات	مس ارسلان بستوی
۲۱۰	ایضاً	لینن اور ادب	ڈاکٹر قمر رئیس
۲۱۱	ایضاً	حفیظ میرٹھی (تعارفی خاکہ)	شکیل احمد عاصم بریلوی
۲۱۲	فروری ۱۹۷۰ء	اشعار کے قبول عام اور بقائے دوام کی بنیادیں	محمد بدیع الزماں

۲۱۳	ایضاً	آنند نرائن ملاّ	عاصم بریلوی
۲۱۴	ایضاً	تبصرہ (نغمۂ شب)	عاصم بریلوی
۲۱۵	شمارہ نمبر ۳، ۱۹۷۰ء	افتخار احمد فہمی مرحوم پر ایک نظر	معین الدین قادری ایم۔اے۔
۲۱۶	مئی، جون ۱۹۷۰ء	لینن اور اردو کے دانش ور	پروفیسر احتشام حسین
۲۱۷	ایضاً	پہلی جنگ آزادی اور اردو	ڈاکٹر شارب ردولوی
۲۱۸	ایضاً	کلیم احمد آبادی (تبصرہ)	عاصم بریلوی
۲۱۹	جولائی، اگست ۱۹۷۰ء	اندازِ بیان پر میر کی تعلیاں اور شعراء کا اعتراف	بدیع الزماں نیا کریم گنج، گیا
۲۲۰	ایضاً	کاکل صبح اور عشرت گرتپوری	شکیل احمد عاصم بریلوی
۲۲۱	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۰ء	اردو رسم الخط (اداریہ)	نیّر سلطان پوری
۲۲۲	جنوری، فروری ۱۹۷۱ء	شکیل بدایونی	عاصم بریلوی، ایم۔اے۔ایم۔کام
۲۲۳	ایضاً	تنقید کیا ہے پر ایک نظر	تقی شبر ردولوی
۲۲۴	مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء	ماریشش میں اردو زبان کا جائزہ	اطہر پرویز
۲۲۵	ایضاً	شکیل بدایونی کا رنگ تغزل	عبدالصمد بی۔ایس۔سی۔بی۔اے۔
۲۲۶	ایضاً	(تبصرہ) پیکر خیال (اختر بستوی کے قطعات کا مجموعہ)	ایڈیٹر
۲۲۷	ایضاً	اردو یونیورسٹی کی تجویز	خواجہ احمد فاروقی
۲۲۸	مئی، جون ۱۹۷۱ء	غالب اپنے خطوط کی روشنی میں	محمد بدیع الزماں، ڈپٹی مجسٹریٹ نیا کریم گنج، گیا
۲۲۹	شمارہ نمبر ۱، ۲، ۳ ۱۹۷۲ء	یادِ رفتگاں	محمد بدیع الزماں، ڈپٹی مجسٹریٹ نیا کریم گنج، گیا
۲۳۰	شمارہ نمبر ۱۲، ۱۹۷۲ء آخری شمارہ	اقبال کا ساقی	محمد بدیع الزماں، ڈپٹی مجسٹریٹ نیا کریم گنج، گیا
۲۳۱	ایضاً	حسین تعارف مطیع اللہ اشہر	ادارہ
۲۳۲	ایضاً	بیکس غازی پوری	بشوناتھ شیدا اعظمی
۲۳۳	ایضاً	تثلیث فن پر تبصرہ	ایڈیٹر

درجن شعراء حصہ لیتے تھے، اس طرح آپ نے پریس مشاعرہ کے ذریعہ قارئین کے ادبی ذوق کی غیر معمولی طور پر آبیاری کی اور نئی نسل کو تصنیف و تالیف کی جانب مائل کیا، ماہنامہ شمع ادب کو برصغیر ہندو پاک کے بیشتر اہم اہل قلم کا تعاون بھی حاصل رہا ہے جن میں آنجہانی فراقؔ گورکھپوری، مجروحؔ سلطانپوری، ثاقب کانپوری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سلام سندیلوی، پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر شاربؔ ردولوی، پروفیسر آلِ احمد سرور، مناظر عاشق ہرگانوی، ذکی انور، بیکل اتساہی، عمرؔ انصاری، یادؔ دہلوی، علی سردار جعفری، ساحرؔ لدھیانوی، واحدؔ پریمی، شفاؔ گوالیاری، ولی صدیقی کلکتہ، بشیر بدر میرٹھی، وسیم بریلوی، بیتاب پیلی بھیتی، شاہد ساگری، شاہد جمال صدیقی، نازشؔ پرتاپ گڑھی، فکری سلطانپوری، فگار اُناوی، قاسم شبیر نقوی نصیرآبادی، بابولال ورمامستؔ، احمد جمال پاشا، سمیعؔ سلطانپوری، محور سلطانپوری، ضیاء الانجم پرتاپ گڑھی، پی۔ پیام بلرامپوری اور عاصمؔ بریلوی، آفتاب لکھنوی، ماہر لکھنوی، خرد فیض آبادی، ابّا غازی پوری وغیرہم قابل ذکر ہیں۔

مندرجہ ذیل سطور میں شمع ادب کے دستیاب شماروں کے ادبی مقالات کی ایک فہرست دی جارہی ہے۔ افسانہ اور غزل وغیرہ کی تفصیل اس چھوٹے سے مضمون میں دے سکنا ممکن نہیں ہے۔ جس کی افادیت مستقبل بعید میں بھی برقرار رہے گی اور اُردو زبان وادب کے محقق، تنقید نگار اور ریسرچ اسکالر اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

نیّر صاحب کے اداریے اکثر و بیشتر اردو زبان و ادب و تعلیم سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے ارباب حل وعقد کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جس کا لازمی نتیجہ اتر پردیش میں پانچ ہزار اردو اساتذہ کی پہلی تقرری اور اتر پردیش اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔

یوپی اردو اکادمی کے قیام کے مقصد پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'اس موضوع پر پہلے بھی لکھا جاچکا ہے لیکن ضرورت ہے کہ بطور یاددہانی پھر لکھا جائے تاکہ ہمارا اردو نواز حلقہ حکومت کی اردو سے متعلق پالیسی کو برابر سمجھتا رہے۔

اردو اکادمی یوپی کے فرائض اولین میں سے یہ تھا کہ وہ ان اسکولوں اور کالجوں میں جہاں اردو پڑھنے والے لڑکوں کو اردو زبان پڑھنے کے انتظامات نہیں ہیں، وہاں اردو کلاسیز کھولے جائیں، چنانچہ جن جن اسکولوں اور کالجوں میں اکادمی نے اردو کلاسیز کھلوائے ہیں، ان کی مفصل رپورٹ شائع کر دی جائے تاکہ عوام مطمئن ہو سکیں۔ اس کے علاوہ اردو میڈیم کورس مہیا کرانے میں اکادمی نے کیا اقدامات کئے ہیں، یہ بھی عوام کو معلوم ہونا چاہئے۔

ہمیں امید ہے کہ یوپی اردو اکادمی جس غرض سے وجود میں آئی، اسے فراموش نہ کیا جائے گا۔ تعلیم کا نصف سال ختم ہو رہا ہے، جو کام اس سلسلہ میں اس سال کے لئے ہونا تھا، ہو چکا ہوگا۔ اب تو اکادمی کی کارگزاری معلوم ہونا ضروری ہے۔'

(اداریہ ماہنامہ شمع ادب، شمارہ ۱۲، ۱۹۷۲ء، ص ۲)

نیّر صاحب، صلح کل کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ انکساری اُن کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ سادہ لوح، فقیر منش اور انسان دوست آدمی تھے۔ بامسلماں اللہ اللہ نا برہمن رام رام اُن کا شیوہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں میں مقبول تھے یہی نہیں سیاسی حلقوں میں بھی بہت عزت و احترام سے لوگ ان کا نام لیتے تھے۔ اُنہوں نے شمع ادب کے ذریعہ اُردو شعراء واُدباء کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا اور برّصغیر کے اعلیٰ درجہ کے زیادہ تر شعراء وادباء اُن سے فیضیاب ہوئے جن میں انصاراللہ نظر، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر شارب ردولوی، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر بیتاب پیلی بھیتی وغیرہم بطور خاص قابلِ ذکر ہیں لیکن کسی اردو دانشور کو نیّر صاحب کی ادبی وصحافتی خدمات پر خامہ فرسائی کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی جس کا نتیجہ ہے کہ تمام تر فکری وفنی بصیرت کے باوجود ان پر کوئی کام نہیں ہوا۔ ایک بےلوث اردو ادب کی خدمت کرنے والا جس نے اپنی ساری زندگی کا اثاثہ اردو ادب کی خدمت میں لگا دی جس کا ثبوت ہے کہ رٹائرمنٹ کے بعد ہی ماہنامہ شمع ادب بھی بند ہوگیا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس عظیم شاعر کے دو مجموعۂ کلام 'انوارِ عرفاں' اور 'ریزۂ مینا' اور ماہنامہ شمع ادب مسلسل ۱۳ رسالوں تک جاری رکھنے والے عظیم شاعر وصحافی پر آج تک کوئی ریسرچ کا کام نہیں ہو سکا جس کی اشد ضرورت تھی۔

ایڈیٹر نیا دور کی کوششوں سے نیا دور ان پر ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے جارہا ہے۔ یہ ان کی شخصیت پر اور اردو ادب کا بہت بڑا سرمایہ ثابت ہوگا۔

نیّر صاحب کے خانوادہ سے معلومات حاصل کرکے یہ مختصر فہرست زیب قرطاس کی جارہی ہے تاکہ اردو کے محقق ناقد اور ریسرچ اسکالر مزید تحقیق کرکے نیّر صاحب کی شخصیت اور ادبی خدمات کا محاسبہ کرسکیں۔

آخر میں نیّر صاحب کے اس شعر کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں:

نیّر سکوت ہی میں ہے آرائشِ چمن
حاصل ہے ہرکلی کو مری بےکلی سے فیض

(ریزۂ مینا)

□□□

در جہان رنگ و بو یک مرد خوش اطوار بود

مرغوب حیدر عابدی

A-47

جیتر نگر، کرشنا نگر

دہلی

رابطہ: 9911105077

اس جہان رنگ و بو میں روز اول سے آج تک جتنے افراد نے جنم لیا، ان کا تعلق کسی نہ کسی شعبۂ زندگی سے ضرور رہا۔ کچھ دانشور ہوئے تو کچھ محنت کش جسمانی، کچھ طلبہ ہوئے تو کچھ اساتذہ اور ان میں جتنے اصل اہل علم تھے، وہ اپنے کو خود طالب علم ہی شمار کرتے رہے اور اس میں فخر محسوس کرتے رہے۔ سچ پوچھئے تو اصل علم انہیں کا حصہ تھا۔ بس ان کے حصہ میں منکسر المزاجی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے علم کو بھی انکسار کا ملمع چڑھا کر پیش کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک ماہر تعلیم، مشفق و مہربان استاد، افسر اور ماہر نفسیات کا نام نامی ہے۔ سید شریف الحسن نقوی (مرحوم) جن کی ولادت ۱۹۲۹ء میں اتر پردیش کی ایک ادبی بستی سندیلہ ضلع ہردوئی میں ہوئی۔ آپ کے والد سید نور الحسن نقوی ایک تعلیم یافتہ سید گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ نقوی صاحب نے ابتدائی تعلیم سندیلہ ہی میں میونسپل بورڈ کے اسکول سے اور پھر انگریزی زبان میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ کانپور کے حلیم ڈگری کالج سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد انہوں نے کرائسٹ چرچ کالج کانپور سے گریجویشن کیا اور پھر ٹیچر ٹریننگ میں ایل ٹی کر کے انہیں وہیں کانپور میں ایس ایس ڈی کالج میں خدمت کا موقع مل گیا۔ وہیں سے ان کی عملی زندگی (کیریئر) کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ استاد رہے۔ وہ تین مضامین میں پوسٹ گریجویٹ تھے۔ (علم سیاست، تاریخ اور اردو) انہوں نے چھ ممالک کا دورہ کیا۔ جن میں بلجیم، انگلستان، جارڈن، عراق، سعودی عرب اور پاکستان شامل ہیں اور یوں زندگی کے مختلف شعبوں میں تجربات حاصل کئے۔ انہیں ۱۹۶۱ء میں بڑی شہرت حاصل ہوئی جب کہ انہوں نے ایک اقلیتی تعلیمی ادارے، امام المدارس میں بطور پرنسپل اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ وہ اپنی علمی لیاقت، محنت، متانت اور ایمانداری، خوش اطواری اور خوش کلامی کے ساتھ ساتھ خطیبانہ صلاحیتوں کی وجہ سے روز افزوں شہرت کی منزلیں طے کرتے کرتے ٹیچنگ کی ہی مزید ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے ۱۹۶۶ء میں وہ انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں سے چند مہینے بعد ہندوستان واپسی پر یو پی ایسوسی ایشن کے ذریعہ ان کا انتخاب راجدھانی، دہلی کے ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن میں پرنسپل کی حیثیت سے ہو گیا۔ انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ کچھ سال تک ایک ہائیر سکنڈری اسکول کی خدمت کی اور پھر اسی محکمہ میں اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں لیکچرر ہو گئے اور پھر وہیں پر ریڈر کے طور پر پروموٹ ہو گئے۔

انہیں جلدی ہی ڈائرکٹریٹ میں ہی ایجوکیشن افسر جسے اسسٹنٹ ڈائرکٹر بھی کہتے تھے، ذمہ داری دے دی گئی۔ اس دوران انہیں دہلی کے اقلیتی تعلیمی اداروں میں سرکاری اعلیٰ عہدہ کی اضافی ذمہ داری بھی دی گئی تھی جسے انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ انہیں جلد ہی کچھ برس کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بطور رجسٹرار ڈیپوٹیشن پر تعینات کر دیا گیا۔ مدت کار پوری ہوئی اور پھر وہ دوبارہ محکمۂ تعلیم میں واپس آ گئے۔

اس دوران ملک میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا مسئلہ زیر بحث آ گیا اور حکومت کے اعلیٰ افسران بالخصوص دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر کو خفیہ طور پر رپورٹس ملیں کہ ملک بھر میں مظاہرے ہوں گے اور دہلی کی مسجدوں سے مظاہروں کے بعد صورت حال بے قابو ہو جائے گی اور انہوں نے اس چیلنج کو بھی بخوبی قبول کیا۔ انہوں نے دہلی میں سرگرم سماجی کارکنوں کے ساتھ مل کر کام کیا اور کامیاب رہے۔ اس بہترین کارکردگی کی وجہ سے وہ دہلی انتظامیہ میں اے ڈی ایم بنا دئے گئے جو ایک خالص ایڈمنسٹریٹو نیچر کی پوسٹ تھی۔ وہاں پر رہتے ہوئے ایمرجنسی کے دوران انہوں نے جو خدمات انجام دیں، ان کی وجہ سے وہ دہلی میں اور زیادہ مشہور ہو گئے اور ان کی شاندار فہم و فراست کی وجہ سے آج تک انہیں لوگ یاد کرتے ہیں۔

اسی دوران دہلی میں اتر پردیش اردو اکادمی کی طرز پر ریاستی اردو اکادمی قائم کرنے کی تجویز زیر غور تھی جو دہلی انتظامیہ کے محکمۂ السنہ کی جانب سے پیش کی گئی تھی جہاں پر انتظامیہ میں ایک دیگر افسر سید محمود نقوی موجود تھے اور سرگرم تھے۔ اس اکادمی کے اغراض و مقاصد اور رولز اینڈ ریگولیشن کے مسودہ وغیرہ کو آخری شکل دینے کی ذمہ داری اس وقت نقوی صاحب ہی کے سپرد کر دی گئی۔ آخر کار ان کا بنایا ہوا مجوزہ اردو اکادمی کا خاکہ مرکزی سرکار کو منظوری کے لئے بھیج دیا گیا جسے کچھ عرصہ بعد من وعن منظوری مل گئی، انہیں لائنز پر جلد ہی دہلی میں پنجابی اکادمی اور ہندی اکادمی بھی قائم ہو گئیں۔ دہلی میں اردو اکادمی نے مئی ۱۹۸۱ء سے باضابطہ کام شروع کیا اور نقوی صاحب کو محکمۂ تعلیم ہی میں رہتے ہوئے اکادمی کے سرکاری سربراہ کی حیثیت سے اضافی ذمہ داری دے دی گئی جو آپ نے اپنی خوبی اور دل جمعی کے ساتھ پوری کی۔ ان کی محنت سے بہت ہی کم عرصے میں دہلی کی اردو اکادمی دیگر ریاستی اردو اکادمیوں کے مقابلہ میں فعال ترین اردو اداروں میں شمار کی جانے لگی۔ آپ نے جو رہنما خطوط اور اصول وضوابط اکادمی کے وضع کئے تھے اور جو روایات قائم کیں، ان پر کاربند رہ کر ان کے جانے کے بعد بھی دیگر کمیٹیاں اور سکریٹری صاحبان بھی کامیاب رہے اور ان اصولوں پر کسی نے تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہاں کئی گرانقدر اضافے ضرور ہوئے۔

اگر ان کی خدمات کا ذکر کیا جائے تو طوالت ہوگی۔ اجمالی طور پر چند کاموں کا ذکر کرنا کافی ہوگا۔ اردو اکادمی، دہلی نے ثقافتی کارکردگی یعنی مشاعروں، شام غزل، آپرا، ادبی سیمیناروں، مذاکروں کے انعقاد کے ساتھ ساتھ اشاعتی میدان میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے نایاب کتابوں کے ساتھ ساتھ دو ادبی جریدوں ایوان اردو اور بچوں کا ماہنامہ امنگ کے نام سے شروع کروائے جن میں ماہنامہ امنگ کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور اسے آٹھ سال کے بچوں سے لے کر اسّی سال کے بوڑھوں تک بڑی دلچسپی سے بڑھتے۔ اسی سبب سے وہ ادبی ماہنامہ سے زیادہ چھپنے لگا۔ انہوں نے اس کام کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی قائم کی تھی بلکہ ہر کام کے لئے اکادمی میں کمیٹیوں کا قیام عمل میں لائے جن کے مشوروں سے کام کرتے اور یوں ان کی ذمہ داری اور آسان ہو جاتی۔ جب جب کسی کام کی نمائش کرنے یا کارکردگی دکھانے کا وقت آتا تو وہ متعلقہ کمیٹی کے چیئرمین و دیگر ممبران کو اہمیت دیتے اور بڑی عزت کے ساتھ انہیں اسٹیج پر جگہ دیتے اور خود کہیں بیک بینچ پر جا کر بیٹھنے میں بہتر محسوس کرتے اور جب ضرورت محسوس کرتے تو آہستہ سے آپ مجمع سے اٹھتے، کوئی ایک جملہ بڑی شائستگی سے بولتے، محفل کو مزید دلچسپ بنا کر دوبارہ اپنی نشست اختیار کر لیتے اور وہ یوں اسٹیج پر بہت کم نظر آتے مگر ہر جگہ ہر دل عزیزی کا مظاہرہ کرتے۔ انہوں نے ادبی سیمینار، ادبی شامیں اور ثقافتی شامیں منعقد کرنے کے ساتھ ساتھ سرکاری اسکولوں کو اردو ٹیچرز مہیا کر کے حکومت کے ساتھ اپنا تعاون پیش کیا۔ اس تمام کارکردگی کے باعث انہیں سبکدوش ہونے کے بعد بھی کئی سال تک مشیر اور اکادمی کے ممبر کی حیثیت سے نامزد کر کے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔

وہ بحیثیت انسان بیحد رحم دل، حد درجہ خلیق اور روادار شخصیت کے مالک تھے۔ کسی سے گفتگو کرتے تو ایسے الفاظ کا استعمال کرتے کہ مدمقابل کو اپنا گرویدہ بنا لیتے، اسے لاجواب بنا دیتے اور کبھی بدظن نہ ہونے دیتے۔ ان کے رابطے میں آنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا کہ گویا وہ صرف اور صرف اس کے ہیں اور دنیا میں کسی اور کے نہیں۔ وہ دوستوں اور بزرگوں کو جن الفاظ میں مخاطب کرتے، وہ بیحد بلیغ ہوتے۔ قبلہ محترم، حضور والا، جناب من اور اسٹاف سے گفتگو کرتے تو بیحد شفقت بھرے الفاظ میں دوران گفتگو وہ اساتذہ کے اشعار پڑھتے یا دانشوروں کے اقوال کوڈ کرتے جن میں سے یادداشت کے گوشوں میں صرف یہ اشعار ہیں جو پیش کئے جا رہے ہیں۔

آہ اے ہندوستاں، یہ تیرے فرزندوں میں فرق
کوئی اک لقمے کو ترسے اور کوئی کھانوں میں غرق

.....

نصیب دشمناں آفت نہ کوئی جوش آ جائے
مگر آفت تو آئے گی نصیب دشمناں کب تک؟

یا اسی معیار کے دیگر اشعار.....

وہ ہمیشہ کلام کا آغاز سلام سے کرتے اور مد مقابل کو سلام کرنے کا موقع کم ہی دیتے تھے، پھر چاہے وہ عمر اور منزلت میں ان سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے الفاظ سے یاد کرتے جن میں بڑی اپنائیت ہوتی اور دلوں کو جیت لیتے۔

وہ اردو کی ترقی کے لئے حکومت ہند کی طرف سے تشکیل شدہ ترقی اردو بورڈ کے ممبر بھی تھے جس کی ذمہ داریوں میں اردو طلبہ کے لئے نصابی کتابیں اردو میں تیار کرا کر متعلقہ ایجنسی کے حوالے کرنا تھا۔ وہ مردم شناس تو تھے ہی، ماہرین کو تلاش کرتے اور یوں متعلقہ مواد تیار کرانے میں بورڈ کے لئے مدد و معاون ثابت ہوئے۔

۲۰۱۲ء میں جب راقم الحروف نے ان سے ملاقات کر کے ان کے خیالات کسی اخبار کے لئے جاننے کی کوشش کی تو اس وقت انہوں نے فرمایا تھا کہ وہ نئے ماحول میں بھی مسلم معاشرت میں مسلم بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی ذہنی نشو و نما کے سلسلہ میں متفکر ہیں۔

خاص طور سے لڑکوں کے مستقبل کو لے کر کیونکہ ان کے نزدیک لڑکیوں میں احساس ذمہ داری اور سنجیدگی لڑکوں کے مقابلہ میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں فحاشی کے بڑھتے رجحانات کے بارے میں جب ان سے سوال کیا گیا تو ان کا خیال تھا کہ یہ رجحان معاشرے میں پہلے سے موجود ہے۔ ہاں، اس دور میں بھی فحاشی پھیل رہی ہے مگر سوشل میڈیا کے چلن کی وجہ سے ہر چیز کی تشہیر آج پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے بڑھتی فحاشی کی بھی عام تشہیر زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان سب باتوں کا تعلق عوامی رجحانات یہ ہے کہ عوام میں ان کا اثر کس طرح قبول کیا جاتا ہے۔ اسی چیز کا اثر ہم مثبت انداز سے قبول کر سکتے ہیں اور اس چیز کو ہم منفی انداز سے بھی قبول کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سائنسی ایجادات کو مثبت انداز سے بھی قبول کیا جاتا ہے اور انہیں کو معاشرے میں تباہی مچانے کے لئے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان تمام ایجادات کو ہمیں مثبت انداز سے استعمال کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس نقصاندہ رجحانات سے گریز کرنا اور معاشرے میں پھیلنے والی برائیوں پر ہمیں قابو پانے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔

وہ بلا کے مردم شناس ہونے کے ساتھ ساتھ فن اور فن پاروں کے حد درجہ قدردان نظر آئے۔ راقم الحروف کا شعری مجموعہ 'بیاض مرغوب' جب منظر عام پر آیا، اسے ان کی خدمت میں برائے مطالعہ بھیجا گیا۔ وہ

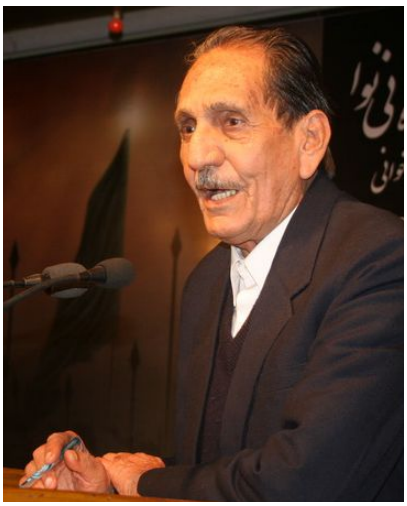

اس کی رسم اجراء میں شرکت کرنا اور ایک مضمون اس پر قلمبند کر کے پڑھنا چاہتے تھے جو وہ کسی مصروفیت کی بنا پر نہ کر سکے لیکن بعد میں وہ مضمون قلمبند فرما کر انہوں نے راشٹریہ سہارا جیسے روزنامے میں شائع ہونے کے لئے بھیج دیا جو شائع بھی ہوا۔ اس مضمون کے اقتباسات ملاحظہ کریں جن کے ذریعہ ان کی علم دوستی اور ذرہ نوازی نظر آجائے گی۔

'ہمارے شعری مجموعے ہمیشہ حمد باری تعالیٰ سے شروع ہوتے ہیں۔ مرغوب نے اس روایت کو قائم رکھا مگر ایک جدت ضرور کی۔ انہوں نے سورۂ حمد کے ترجمے کی شکل میں حمد پیش کر کے اپنی عقیدت کا ثبوت دیا۔ ترجمہ شعری اوصاف کا حامل تو ہے ہی مگر اصل متن کا حسین عکاس بھی ہے۔ بارگاہ ایزدی میں عرض کرتے ہیں:

ہے دعا، تو ہماری ہدایت کر لے
نیک بندوں کا رستہ دکھاتا رہے
ہاں مگر ان کے رستے سے بچنا سکھا
جن پہ غیظ و غضب تیرا نازل ہوا'

اسی تبصرہ کو بڑھاتے ہوئے آگے تحریر فرماتے ہیں:

صبح و شام زیارتوں کی خواہش دل میں لے کر ہر معصوم ہر امام اور خود نبی مکرم کی بارگاہ میں دست دعا کو پھیلانے والے کی دعا کیسے منظور نہ ہوتی؟ اللہ پاک نے کرم کیا۔ ان کی خواہش پوری کی اور انہیں عمرے کی سعادت سے ہم کنار کیا۔ زیارت کا یہ متمنی علم کی دعا بھی مانگتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک بار نہیں دس بار اور پھر اس دعا میں بھی وہ کامیاب نظر آتا ہے۔ زیور علم سے آراستہ ہو کر انہوں نے سرکاری ملازمت میں اعلیٰ مدارج حاصل کئے۔ مہد سے لحد تک علم حاصل کرنے کی ہدایت کو عملی جامہ پہنانے والے مرغوب ایک قصیدے میں علم کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

بھکاری ہوں، بشارت علم کی مجھ کو عطا کیجئے
کرم کر دیں تو ہو جاؤں تونگر، ساقیٔ کوثر!'

کلام مرغوب ملاحظہ کریں اور ان کی تحریر دیکھیں۔ یہ ذرہ نوازی اور قدر شناسی نہیں تو اور کیا ہے؟ ان کی تحریروں سے ان کی خوش کلام شخصیت، ان کے قلم اور زبان کی روانی اور خوش بیانی کا علم ہوتا ہے۔ وہ تقریر اور تحریر دونوں میں مختصر بیانی اور مختصر نویسی کو پسند فرماتے اور اپنے اس وصف میں دو علمائے دین حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور جید عالم دین مفکر اور خطیب عالی جناب مولانا سید علی نقی النقوی (مرحوم) و مغفور و اعلیٰ اللہ مقامہ سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں کہ جن دو بزرگواروں کی تحریریں اور تقاریر یکساں اثرات کی

حامل ہوتی ہیں۔ انہوں نے ریڈیو، اخبارات اور علمی جرائد کے لئے مختلف موضوعات پر لکھا۔ اساتذۂ سخن کے کلام پر لکھا اور ٹاکس لا رتقاریر پیش کیں جنہیں جمع کر کے زیور طبع سے آراستہ کرنے اور فیضیاب ہونے کی ضرورت ہے۔ ان کی تحریر کا عکس اس مضمون کے آخر میں ملاحظہ کریں۔

سب کو اشکبار چھوڑ کر یکم نومبر ۲۰۱۵ء کو ۸۶ رسال کی عمر میں اسم بامسمیٰ کہے جانے والے سید شریف الحسن نقوی صاحب دہلی میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ بعد نماز عصر جب ان کا جنازہ، نئی دہلی میں واقع جامعہ ملیہ کے قبرستان لے جایا گیا تو اس میں شرکت کرنے والوں کا سوگوار مجمع جس میں ہندو، مسلم، ہر مذہب وملت کے لوگ بھاری تعداد میں موجود تھے۔ یہ بات ان کی ہر دلعزیزی پر ایک دلیل کے لئے کافی ہے۔ چونکہ انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار کی حیثیت سے کئی سال خدمات انجام دی تھیں اس لئے ان کی اسی خدمت کے اعتراف میں انہیں جامعہ کے وی آئی پی قبرستان میں جگہ ملی جو کچھ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی کے ترجمان 'ایوان اردو' میں ان کی یاد میں اداریہ لکھا گیا جو ان کے گرانقدر کارناموں کا مختصر جائزہ تھا اور معروف قلمکار اور محقق ڈاکٹر سید مظفر حسین سید نے ایک مضمون میں ان کی شخصیت کی تصویر کشی کرتے ہوئے بجا طور پر اعتراف کیا:

'شریف صاحب کی ایک بے مثل خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی کسی حقدار کو اس کا حق رسید کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ شاید وہ اپنے خاص مزاج اور طبیعت کے زیر وصف ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے، خواہ وہ حق کسی ادیب، شاعر کا ہو، کسی دفتری عامل کا یا کسی معمولی آدمی کا جس نے ان کے ساتھ ذرا سا بھی تعاون کیا ہو'

آگے لکھتے ہیں:

'شریف صاحب کا امتیاز یہ تھا کہ وہ خالصتاً مجاہد اردو تھے۔ وہ نہ تو باضابطہ شاعر یا ادیب تھے، نہ انہوں نے خواہ مخواہ ہی تصنیفات کا انبار لگایا مگر اردو کے لئے جہاد روز اول سے دم آخر تک کیا۔ وہ سرتاپا عمل اور فعال تھے۔'

وہ آگے لکھتے ہیں:

'روہیل کھنڈ، اودھ اور پھر دہلی کی اقدار نے ان کی شخصیت کو مثالی بنا دیا تھا جو ایک جانب اگر قوی اور مستحکم تھی تو دوسری طرف انتہائی مہذب اور اخلاق حسنہ سے مالا مال۔ شہروں اور اداروں کی طرح شخصیات بھی بتدریج تشکیل پاتی ہیں نیز ان کی نشوونما میں مختلف النوع اوصاف نیز باہم متضاد عناصر کا عمل دخل ہوتا ہے تبھی تو شریف الحسن جیسے انسان بنتے ہیں۔ بقول حالیؔ

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں ہوتی ہے محنت زیادہ'

اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے وہ ہر وقت متفکر رہتے تھے۔ اس مضمون کے حسب ذیل اقتباس سے ان کی فکری مندی صاف جھلکتی ہے:

'مہربان مکرم نے صبح صبح یاد فرمایا۔ ملاقات گوشۂ تنہائی میں ہوئی۔ اس وقت شریف صاحب خاصے کبیدہ خاطر نظر آرہے تھے۔ اچانک انہوں نے تقریباً سرگوشی میں سوال کیا: آپ کو معلوم ہے کہ اردو کا اصل دشمن کون ہے؟ خاکسار بہ لحاظ سوئے ادب خاموش رہا کہ اب یہ خود ہی جواب بھی دیں گے اور وہی ہوا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ گویا ہوئے۔ اردو کے اصل دشمن تو خود اردو والے ہیں۔ اردو کے تندور پر روٹیاں سینکتے ہیں اور خود اپنی نسل کو اردو پڑھاتے نہیں۔ آپ ان سے پوچھئے کہ کتنوں نے اپنے بچوں کو مولوی اسماعیل میرٹھی کی پانچوں کتابیں پڑھائی ہیں۔ پھر اردو کی بنیاد درست کیسے ہو؟'

دوران گفتگو یہ راز بھی کھلا کہ ان کی اس وقت کی اداسی کے لئے گنہگار کوئی اور نہیں، یہ خاکسار ہی تھا کیونکہ اسی صبح انہوں نے راقم الحروف کا مضمون 'اردو کا مقدمہ' شائع شدہ 'ہماری زبان' کو شرف مطالعہ بخشا تھا اور اس مضمون کے لہجے نے ہی انہیں اس عمیق غور وفکر سے دوچار کیا تھا۔ اس گفتگو کے بعد آنکھیں اٹھیں تو وہ اشکبار تھے۔

اس دردمندی اور دلسوزی کی مثال اب کہاں۔'

ماخوذ: شریف اردو کا سفر عدم (ڈاکٹر مظفر حسین سید، ایوان اردو، دسمبر ۲۰۱۵ء)

اس ضمن میں راقم السطور کا اضافہ ملاحظہ کریں جو اس کے مشاہدے پر مبنی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو کے اردو والوں کی وہ عملی سرپرستی حاصل رہے جس کی آج اسے ضرورت ہے یعنی یہ کہ بچوں کو اپنے طور پر اردو پڑھانا یا پڑھوانا۔ اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو ہر ممکن روزگار دلانا، ان کی ہر ممکن مدد کرنا، اردو کے طلبہ کی ہر طرح سے امداد کرنا، ان کی فیس وغیرہ میں ان کی مدد کرنا، ان کے لئے نصابی کتابوں کی فراہمی کرنا یا کرا دینا۔ اردو اساتذہ کی سرپرستی کرنا، اردو کے پڑھنے پڑھانے کے لئے بالغان کے مراکز قائم کرنا کرانا، ان مراکز کے لئے ریڈنگ میٹریل فراہم کرنا یا کرانا۔ اردو کے اخبارات اور اردو کتب کی طباعت و اشاعت میں ہر ممکن مدد کرنا۔ نچلی سطح پر گزر اوقات بسر کر رہی اردو آبادی کی ہر ممکن معاونت کرنا، ان کے لئے ہر طرح کی ممکن مراعات کا انتظام کرا دینا۔ اردو کتب فراہم کرا کر لائبریریوں کی مدد کرنا اور غیر سرکاری انجمنوں کے ساتھ مل کر اردو کی درس وتدریس کا انتظام کرنا اور اردو آبادی میں اردو مشاعروں، مختلف قسم کے پروگراموں، ڈراموں اور نکڑ ناٹکوں کے ذریعہ تعلیم کی شمع روشن کرنا نیز اردو کی تعلیم سرکاری سطح پر بھی جاری رکھنے کے لئے

خواہ سرکاری محکموں کی مدد کرنا پڑے، کر دینا۔ یہ تمام کام ان کے نزدیک موجودہ دور میں اردو کو درکار تھے اور وہ خود انجام دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

ان کے جسد خاکی کو سپرد خاک کرتے وقت راقم السطور رنج وغم کے اتھاہ سمندر میں غرق اپنی مختصر اور سبک مدت زندگی میں ان کے بیش قیمتی فیوض و برکات کا اجمالی جائزہ لیتا رہا اور اندر ہی اندر چشم بینا سے ان کی قدآور شخصیت کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ کبھی مشفق استاد کی شکل میں نظر آئے تو کبھی مددگار سرپرست کی صورت میں، کبھی ایک مخلص اور دردمند انسان کے لباس میں تو کبھی دفتر مصروفیات اور ذاتی معاملات میں الجھے ہونے کے باوجود اس کم سواد کو بڑی کشادہ دلی کے ساتھ برداشت کرنے والے مہربان انسان کے روپ میں۔ کبھی دعاؤں بھری اس شفیق آواز کو سن رہا تھا جس سے سماعتیں آشنا تھیں۔ کبھی ان کے بلیغ فقروں اور جملوں کو محسوس کر رہا تھا، جو ہر موقع پر حوصلہ افزا ثابت ہوتے۔ میں سوچ رہا تھا۔

نقوی صاحب مرحوم جب امروہہ میں امام المدارس میں انٹر کالج میں پرنسپل تھے۔ اس کم علم کو ان سے اس وقت کی واقفیت تھی جب کہ درجہ آٹھ کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے امتحان کے وقت وہ نہایت اسٹرکٹ ایگزامنر تھے اور میٹرک کے امتحان کے بعد جب میں پاس ہوا تو ان کی براہ راست نگرانی میں آ گیا تھا مگر چند ماہ بعد میرے استاد وہاں سے انگلینڈ چلے گئے۔

مختصر مدت کے بعد انگلینڈ سے واپسی پر دہلی میں آ کر آباد ہو گئے تو اس کم ہنر کو ان کی ہنرمند سرپرستی دوبارہ حاصل ہو گئی۔ وہ اس حد تک پابند نظام الاوقات تھے کہ ان کے طور طریقوں سے ان کے روزمرہ کے حرکات وسکنات سے گھڑی کا ٹائم ملا لیا جائے۔ کسی بھی کام میں ان کا انداز پیشکش ایسا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عظیم سربراہ ہے جو اپنی ذمہ داریوں کی بجا آوری میں ہمہ تن مصروف ہے اور وہ ہر سمت بڑے موثر نقوش مرتب کر دیتے۔

ان کی ذات گرامی کا، ان کے تجربات کا

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

اس ناچیز نے کتنا اثر قبول کیا، اس میں خود اپنے آپ کو ناکام محض محسوس کرتا ہوں مگر اتنا ضرور عرض کر دینا ناگزیر سمجھتا ہوں کہ اردو اکادمی، دہلی کی خدمات کا جتنا بڑا عرصہ ان کی شخصیت کے حصے میں آیا، ان کے بعد آنے والے سکریٹری صاحبان میں راقم السطور کا (ان کے بعد) دوسرا نمبر ہے۔ یہ بات فخر کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہے کہ ہر مقام پر ناچیز کے ہمدردوں نے ان سے مشورہ لیتے رہنے کی صلاح دی۔

پروفیسر قمر رئیس کے انتقال کے بعد جب انہیں اکادمی کے وائس چیئرمین کی ذمہ داری دی گئی تو یہ حقیر ہی ان کی چھوڑی ہی بلند و بالا نشست پر متمکن تھا یعنی سکریٹری تھا۔ پھر دوبارہ اس دور میں دستیاب ان کی شفقتیں اور محبتیں، سرپرستی اور مشورے سب کچھ یاد آتا رہا۔ وہ میری مدت کار میں تین بار اردو اکادمی کے ممبر نامزد ہوئے اور تینوں بار کسی نہ کسی سبب کمیٹی کے چیئرمین/کنوینر بنائے گئے۔ اس مدت میں تمام وائس چیئرمین صاحبان نے ان کی بڑی عزت وتوقیر کی۔ پھر وہ چاہے سابق ممبر پارلیمنٹ م افضل صاحب رہے ہوں یا پروفیسر قمر رئیس۔ وہ سب کے معزز ترین رکن تھے۔

پروفیسر اختر الواسع بھی انہیں برابر بہت اچھے ناموں سے یاد کرتے رہے۔ ان کی تدفین میں موجود کثیر مجمع جس میں ہر مذہب وملت کے لوگ شامل تھے، وہ سب ان کی ہر دلعزیزی کی گواہی دیتے رہے اور یہ حقیر ان کے تینوں فرزندں سید فضل علی نقوی، سید فضل حسن نقوی اور سید فضل حسین نقوی کے چہروں میں ان کی بارعب شخصیت کو تلاش کرتا رہا اور ان کے برادر حقیقی سید صغیر الحسن نقوی اور اہلیہ بیگم نجمہ نقوی کے حق میں دعائیں کرتا رہا۔

شاید کسی فارسی شعر کے تخلیق کار نے ان الفاظ میں مرحوم ہی کو یاد کیا ہے:

در جہان رنگ و بو یک مرد خوش اطوار بود
ہر کہ دانشور بداند فرد خوش گفتار بود

❑❑❑

جوش ملیح آبادی کی فطری شاعری

ڈاکٹر رضیہ پروین

اسسٹنٹ پروفیسر اردو

گورنمنٹ گرلس ڈگری کالج

رامپور

رابطہ: 9457387505

اردو شاعری میں جوش کی نظمیں بے پناہ شہرت و مقبولیت کی حامل ہیں۔ان کی ادبی شخصیت شعر، تنقید، خاکہ، انشاء پردازی اور سوانح نگاری جیسی تنوع جہتوں میں پھیلی ہے۔لیکن جوش نے اردو شاعری خصوصاً اردو نظم پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

''جوش جیسے شاعر اپنے وقت کی آپ ہی آواز ہوتے ہیں وہ بیسوی صدی کی سب سے بڑی اور عظیم شعری آواز تھے۔وہ نظم کے جادوگر اور نظم کے قافلہ سالار گردانے جاتے ہیں۔شاعر انقلاب، شاعر شباب، شاعر رومان، شاعر جذبات، شاعر فطرت اور شاعر اعظم کے خطابات سے نوازے گئے۔''

(انتخاب جوش۔ص نمبرے عصمت ملیح آبادی)

جوش کے یہاں نگارشاتِ فطرت اور حسن فطرت کا ایک جہاں آباد ہے اردو کی منظریہ شاعری میں وہ انگریزی کے کٹس اور پی بی شیلی سے بھی آگے نکل گئے ہیں اور کہیں کہیں تو ان کو مات دیتے بھی نظر آتے ہیں۔

منظر نگاری ان کی شاعری کا خاص وصف ہے جن کا چند صفحات پر احاطہ کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ دریا کو کوزے میں بند کرنا۔ان کی نظموں میں بے پناہ روانی، سلاست اور برجستگی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کوئی آبشار مچلتا اور شور مچاتا ہوا اور کہیں کہیں مدھم مدھم سروں میں گنگناتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔

''نظم سورہ رحمٰن'' میں حسن فطرت کی جولانی دیکھتے بنتی ہے جس میں انسانی زندگی کے رموز و حکایات کو سمجھنے کا فلسفہ بھی نظر آتا ہے۔

سبز گہرے رنگ کی بیلیں چڑھی ہیں جابجا
نرم شاخیں جھومتی ہیں، رقص کرتی ہے صبا
پھل وہ شاخوں میں لگے ہیں، دل فریب و خوشنما
جس کا ہر ریشہ ہے قند و شہد میں ڈوبا ہوا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

صبح کے شفاف تاروں سے برستی ہے ضیا
شام کو رنگ شفق کرتا ہے ایک محشر بپا
چودویں کے چاند سے بہتا ہے دریا نور کا
جھوم کر برسات میں اٹھی ہے متوالی گھٹا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

جوش نے مناظر قدرت کو بڑی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔صبح کی منظر کشی کتنے دلکش پیرائے میں کی ہے جس کی مثال کم یاب ہے۔

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لو تھرتھرا رہی ہے
روش روش نغمہ طرب ہے چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے
ستارہ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی، کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی؟
نہیں؟ یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی کلی مسکرا رہی ہے۔
(نظم البیلی صبح)

پروفیسر محمد حسن رقم طراز ہیں:

''مناظرِ فطرت کی جو پرجوش اور پرکیف عکاسی ان کے یہاں ملتی ہے اس کی نظیریں ہمارے یہاں کم ہے۔ جو مردوں میں جان، جذبات میں طوفان بپا کردے اور اہلِ نظر کو ثبوتِ حق پہنچادے۔''

ویسے دیکھا جائے تو جوش فطری طور پر نظموں کے شاعر ہیں مگر اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا ہے اور اسے نئے رنگ و آہنگ اور نیا لب ولہجہ عطا کیا۔مگر جوش کا اصل جوہر ان کی نظموں میں ملتا ہے۔حسن وعشق ان کی شاعری کے محبوب موضوعات ہیں وہ حسن کے شیدائی ہیں حسن ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ حسن کی بارگاہ میں اپنا سب کچھ قربان کردینے پر راضی نظر آتے ہیں جنگل کی شہزادی'' اور فتنہ خانقاہ'' اس کی بہترین مثالیں ہیں:

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں
کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں
لہروں میں جیسے کوئی دل کو ڈبو رہا تھا
میں سو رہا ہوں ایسا محسوس ہورہا تھا
ایک موج کیف پرور دل سے گزر رہی تھی
ہر چیز دلبری سے یوں رقص کر رہی تھی
(از جنگل کی شہزادی)

ساون کا ابر کا کل شب گوں کے دام میں
موجیں شراب سرخ کی آنکھوں کے جام میں
رنگ طلوع صبح رخ لالہ فام میں
چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں
انساں تو کیا یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبک دری کو ملی نہیں
(فتنہ خانقاہ ص ۱۵)

جوش کے اشعار دلوں میں تڑپ اور احساس پیدا کرنے والے ہیں۔ بے شمار ایسے اشعار ہیں جس میں زندگی چلتی پھرتی اور دوڑتی نظر آتی ہے۔کچھ اشعار تو ایسے ہیں جس میں مکمل زندگی کا نقشہ ہی اتار کر رکھ دیا ہے۔ زندگی کے جذباتی پہلو بھی ان کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے لیکن وہ جب حسن فطرت اور مناظرِ قدرت کا ذکر کرتے ہیں اس میں وہ پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' میں دیہات کے دوپہر کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ جذبات کی عکاسی بھی بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔

دوپہر بازار کا دن گاؤں کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لو کا زور
آگ کی زد کاروبار زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرے گرم جھونکے آفتاب
شور ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار
بیل گھوڑے بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ گڑ کی بومرچوں کی دھانس
خربزے آلو، گھلی، گیہوں، کدو، تربوز گھانس
(از۔گرمی اور دیہاتی بازار)

جوش کو قدرتی مناظر اپنی طرف پوری شدت سے کھینچتے ہیں جب وہ نظارہ فطرت میں محو ہوکر نغمہ سرائی کرتے ہیں تو قاری کو اور ہی دنیا میں پہنچادیتے ہیں۔ سچ تو ہے کہ جوش کی شاعری کا احاطہ انقلاب و رومان و شباب کے پس منظر کے ساتھ ساتھ فطری جمالیات کو ساتھ رکھ کر نہ کیا جائے گا تو اس وقت تک صحیح نتیجہ پر پہونچنا ممکن نہیں۔ اگرچہ کہ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم فرسائی کی ہے مگر مناظر فطرت اور کمالات قدرت کو جس خوبی وخوبصورتی سے انھوں نے پیش کیا ہے۔وہ نہایت اہم ہیں:

روح شاعر آج پھر ہے، وجد میں آئی ہوئی
آم کے باغوں میں پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
مست بھنورا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی
غنچہ غنچہ اپنی فطری رنگ میں ڈوبا ہوا
پتی پتی اپنے اصلی رنگ پر آئی ہوئی
خار صحرا فیض ابرو باد سے نکھرے ہوئے
خاک گلشن، موج رنگ و بو سے اترائی ہوئی

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک ایک لفظ سے جادوئی کیفیت اور سحر وجدانی قاری کے ذہن ودماغ پر ثبت کیا جاسکتا ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسین:

''جوش کا کلام لفظوں کی انمول اور بے مثال قوس قزح ہے، رنگ احساس تصور کا ایسا خزانہ ہے جس کی مثال سودا نظیر اور انیس کے علاوہ ہزار سال کے اردو ادب میں ناپید ہے۔''
(قومی آواز۔کام۔۲۳ فروری ۲۰۱۸)

جوش کا کلام تصویر کاری و مصوری کے ساتھ ساتھ احساس انسانی کو بھی سمو دیا ہے۔جس کی مثال شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔نظم تو اگر واپس نہ آتی، کے چند اشعار قابل ملاحظہ ہوں:

دفعتہ وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبض ساحل چھوٹنا
کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں
صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات
چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر دھندلی سی دو پرچھائیاں

جوش قدرت کے ہر موسم، ہر رنگ، ہر ادا کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی فنکارانہ صلاحیت اور شعری بصیرت کے بناء پر اس درجے کی تصویر کشی کرتے ہیں کہ وہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں اور ایک نئے لب و لہجے اور رنگ و آہنگ سے اپنی شعری کلام کو آراستہ کرتے ہیں نظم ''الوداع'' کو خاص معنی و مفہوم دیکر اپنے جذبات و احساسات کا آئینہ بنا دیا ہے۔ اور جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے اشعار کو تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہے۔

آم کے باغوں میں جب برسات ہوگی پرخروش
میری فرقت میں لہو روئے گی چشم مے فروش
اسکی بوندیں جب اڑا دیں گی گلستانوں کے ہوش
کنج رنگیں میں پکاریں گی ہوائیں جوش جوش
سن کے میرا نام موسم غمزدہ ہوجائے گا
ایک محشر سا گلستاں میں بپا ہوجائے گا
(نظم الوداع،ص۲۶)

جوش کی شاعری ہمہ جہت ہے، فکر و فن کی نیرنگیاں اور حسن و جمال کی سرمستیاں ان کے کلام کی خاصیت ہے ان کے یہاں حسن فطرت صرف فطرت نگاری نہیں بلکہ حیات و کائنات کے اسرار و رموز کی موشگافی کرتی ہے جنگل کی شہزادی'' البلی صبح، بدلی کا چاند،شام اور اس کی آرائیاں، دھوپ چھاؤ وغیرہ نظمیں محکات اور پیکر تراشی کا خوبصورت نمونہ ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو برسات، کہسار، صبح و شام ماہ و خورشید، شبنم اور اس کی بوندیں، دریا، گھٹا، بجلی کی کڑک، چمک بادلوں کی گھن گرج، کوئل کی کوک، آم کے باغ، کوہ و دشت کو اپنی منظر یہ شاعری میں پیش

خصوصی نمبر کی اشاعت

ماہنامہ 'نیادور' عنقریب گورکھپور کے ادبی و تہذیبی آثار پر ایک خصوصی نمبر کی اشاعت کرنے جارہا ہے لہٰذا اہل قلم حضرات گورکھپور کے ادبی حلقوں سے وابستہ ادبا وشعرا و ناقدین کی تخلیقات پر اپنے قلمی نگارشات ہمیں ارسال کرسکتے ہیں۔

اس خصوصی نمبر سے متعلق آپ کے مضامین ایک تاریخی و ادبی دستاویز کی تدوین میں خاص اہمیت کے حامل ہوں گے۔جس کے لئے ماہنامہ 'نیادور' آپ کا شکر گزار ہوگا۔

ایڈیٹر
ماہنامہ 'نیادور'

کرنے کا ہنر بخوبی معلوم ہے اور اس طرح نئی معنویت عطا کر حیرت و انبساط کی کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میداں کا دل گھبرانے لگا
ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑا دی سلجھا تو ضیا برسانے لگا
کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے کیا قید ہے کیا آزادی ہے؟
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا
(از: بدلی کا چاند)

عصمت ملیح آبادی انتخاب کلام جوش، ص ۸ میں رقم طراز ہیں:

''فطرت نگاری میں جوش زندگی کے آخری ایام تک مسلسل ارتقائی منزلوں کو طے کرتے رہے ہیں۔ وہ فطرت کے پجاری ہیں جسے انھوں نے سینکڑوں رنگوں اور ناموں سے یاد کیا ہے۔ جھرنوں کی جھر جھراہٹ، دریاؤں کی روانی، برسات کی دلفریبیاں، طلوع و غروب کے مناظر کا بیان ان کی سیکڑوں نظموں میں پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ساون کے مہینے، برسات کی چاندنی، موج باراں، برسات کی شفق، پہلی گھٹا، بہار کی دوپہر، بھیگی رات، برسات کی شام، بہار کا ترانہ، شام کی بزم آرائیاں، الیلی صبح، بدلی کا چاند، اور نغمہ سحر وغیرہ نظمیں ان کی فطرت نگاری کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔''

جوش کو خود اپنی شعری نغمگی پر فخر تھا نظم'' میرے بعد'' میں یہ بات صاف صاف نظر آتی ہے:

وہ نہ الفاظ کے نغمے نہ وہ معنی کا سرور
گنگ ہے مطرب انداز بیاں میرے بعد
تیر وہ دل پر لگا ہے کہ لچکتی ہی نہیں
ابروئے شعر کی گل ریز کماں میرے بعد

بقول پروفیسر آل احمد سرور: '' جوش کی حسن کاری میں کلام نہیں ان کی تشبیہات دلکش اور معنی خیز ہوتی ہیں ان کا تخیل لالہ کار ہے، دور رس نہیں۔ انسانیت سے اس قدر گہری محبت اور اس کے روشن مستقبل پر یقین محکم نے ان کے کلام میں بڑی آب و تاب پیدا کردی ہے۔

□□□

فانی کی شاعری کے کچھ اہم رموز ونکات

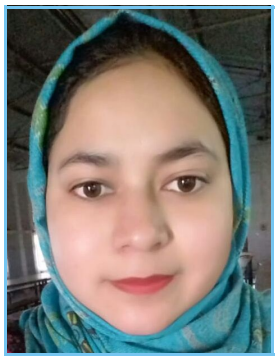

گلشن بانو وفاؔ

محلہ بی بی زئی ہدف

شاہجہانپور

رابطہ: 8299423206

اردو زبان کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ یہ جہاں بھی جاتی ہے لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام، اپنی محبت پیدا کر لیتی ہے۔ اردو کی شیرینی کی وجہ سے اس کے خدمت گار سارے جہاں میں پھیلے ہوئے ہیں اور جب 'اردو' شاعری کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ بھی صنف غزل میں تب اس کی چاشنی و شگفتگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فانیؔ اسی صنف غزل میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ فانیؔ کی شاعری پر ان کی ذاتی حالات زندگی کا بھی بہت اثر رہا ہے۔ فانیؔ حسن و عشق کی محفلوں میں ہوں یا کسب معاش کی منزلوں میں جہاں سے گذرے اپنی خودداری کو سنبھالے ہوئے گذرے۔

فانیؔ کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے سے احساس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی اور ماحول میں کوئی انقلاب نہیں تھا۔ جو کسی شاعر یا فرد کی زندگی میں تہلکہ مچا دیا کرتا ہے جو نشیب و فراز ان کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ ان کی حیثیت سیلاب یا طوفان کی نہیں ہے۔ وہ چند لمحات کے لئے تو غضب ناک ہو سکتا ہے ورنہ سکون اور خاموشی ہی نظر آئے گی۔ اس کا بڑا سبب فانیؔ کا بے نیازانہ طرز عمل تھا جس نے کبھی تمناؤں کو اجازت نہ دی کہ وہ ہنگامہ پیدا کرے۔ فانیؔ کی زندگی میں جب قرض کا بوجھ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو معاشی پریشانی نے بھی ان کی زندگی پر اثر ڈالا اور شاعری پر بھی۔ ۱۹۱۵ء میں والد کا انتقال اور ۱۹۱۷ء میں والدہ کا انتقال، علی گڑھ میں ان کی بیاض کا چوری ہو جانا، ان کی بیگم کے انتقال کے بعد ان کے محسن مہاراجہ کشن پرشاد کا انتقال ہونا وغیرہ۔ اور دنیا کی یہ بے ثباتی ہمارے شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے۔ مگر اس بے خیالی کے تصور نے رہبانیت اور زندگی سے فرار کا رجحان پیدا کیا اور دنیا سے دل نہ لگانے کی تعلیم دی۔ دنیا اور غم دنیا کے بارے میں فانیؔ کا مسلک آزادی و بے نیازی کا مسلک ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا کو بے ثبات خیال کرتے ہیں بلکہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کے اس قدر مصائب اور مسائل کے بعد بھی وہ کیا چیز ہے جو ان کے اعتماد کو برقرار رکھتی ہے۔ وہ دراصل ان کی مذہبی اور روحانی قدریں اور خدا پر بھروسہ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو فانیؔ کو قنوطیت کے قریب سے واپس لے آتی ہے۔ فانیؔ کا پورا کلام پڑھ جائیے اس میں ایسے کم مقامات ملیں گے جہاں وہ خدا سے مایوس ہوتے ہوں۔

فانیؔ کی شاعری میں مختلف قسم کی خصوصیات ملتی ہیں۔ جیسے حسن و عشق، محبت، غم، فلسفہ اور تصوف وغیرہ۔ غزل کا مزاج دراصل عاشقانہ ہے۔ اس کے خمیر میں سب سے زیادہ جس چیز کا عنصر غالب ہے وہ حسن و عشق کے نغمے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غزل کی آفاقیت اور لچک نے دوسرے تصورات کو اپنا تو لیا مگر ان کو اپنا خاص موضوع نہیں بنایا۔ لیکن تصوف جیسے موضوعات کی بنیاد چونکہ جمالیاتی تصور پر قائم تھی۔ اس لیے غزل اور تصوف ایک دوسرے سے جلد مانوس ہو گئے۔ تصوف کی راہ سے جو بھی موضوع غزل میں داخل ہوئے وہ اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔ رفتہ رفتہ تصوف نے غزل کے مزاج میں اس حد تک دخل پا لیا کہ وہ غزل پھیکی معلوم ہونے لگتی جس میں تصوف کی چاشنی نہ ہوتی۔ فانیؔ کے یہاں تصوف رومانی اور اخلاقی نظم و ضبط کا ایک جامع نظام ہے۔ اس کے ماخذ قرآن مجید اور احادیث نبوی کی تعلیمات ہیں یا اکابر صوفیہ کے اقوال و اعمال ہیں۔ اس تصوف کی راہ خلوت اور کوہ ودشت کی جانب نہیں جاتی بلکہ انسانی زندگی کے ہنگامہ زار میں رہتے ہوئے روح کے خلوت کدے کی جانب سالک کی رہنمائی کرتی ہے۔ فانیؔ کے کلام میں تصوفانہ افکار و واردات سے جو شدید وابستگی نظر آتی ہے اس میں ان کے وطن (بدایوں) کی دینی روایات کا بھی حصہ ہے۔ ان کی نجی زندگی کے واقعات وحوادث نے بھی ان کے میلان طبع کو تقویت پہنچائی۔ اس کے علاوہ مغرب کے مطالعہ نے بھی ان کے احساسات و افکار کو ربط اور آہنگ عطا کیا۔ ان کی حیثیت نہ اس مذہبی زاہد کی سی ہے جو مسند ارشاد پر متمکن ہے اور نہ اس فلسفی کی سی جو خشک مسائل کو اپنا اوڑھنا بچھونا قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوف میں فانیؔ کا بے پایاں خلوص شامل ہے۔ جس میں ان کے فلسفیانہ ذوق طبیعت نے نکھار پیدا کر دیا۔ دل میں محبت کی کسک تھی۔ طبیعت میں فلسفہ کا مذاق تھا۔ دونوں کے خمیر سے تصوف کا رنگ پیدا ہوا۔ وہ اسے ذریعۂ انسانیت خیال کرتے ہیں اور یہ کمال انسانیت یا مطلوب حقیقی تعلقات وروابط کی اصلاح ہی سے میسر آتا ہے۔ فانیؔ بدایونی فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مفکر شاعر تھے۔ اپنی غزلیات میں انہوں نے اپنے فکرات اور تصورات کا اظہار بڑے سادگی بھرے انداز میں اور حسین وجمیل پیرائے میں کیا ہے۔ فانیؔ نے اپنے انداز بیان سے غزل کو نئی بلندیاں بخشی ہیں۔ ان کی غزلیات کے چند اشعار پیش نظر ہیں۔

درد مندانِ وفا کی ہائے رے مجبوریاں
دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

.....

ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں
زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں

.....

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھ
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

.....

یہ عرش کو سو بار ہلا آئی ہے
آواز شکست دل کی طاقت کو سمجھ

.....

نگاہِ قہر خاص ہے مجھ پر
یہ احساں ہوا ستم نہ ہوا
اب کرم ہے تو یہ ملا ہے مجھے
کہ مجھی پر ترا کرم نہ ہوا

.....

کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں
دردِ دل دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کئے

فانیؔ نے اپنی شاعری کا محور انسانی زندگی اور اس کے جذبات کو بنایا۔ چونکہ فانیؔ کی ذاتی زندگی میں غم بہت تھا۔ اگر ہم انسان کی زندگی کے تجربات اور حالات پر غور کریں تو ہمیں اس میں دو عنصر کارفرما نظر آئیں گے۔ غم اور مسرت۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں جیسے ایک ورق کے دو صفحے۔ لیکن جب غم زندگی بن جائے اور جب زندگی کی خواہش بھی عزیز نہ رہے۔ اس وقت موت سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں۔ اس کی تاریکی روشنی پیدا کر سکتی ہے۔ غم ایک ایسی شئے ہے کہ جس کی شدت میں انسان ایسی ایسی مشکلات کو عبور کر لیتا ہے اور ایسی ایسی آزمائشوں سے گذرتا جاتا ہے کہ جن کا تصور بھی معمولی حالت میں اس کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ غم کی فراوانی کبھی کبھی خودکشی کا باعث بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ غم کا قصور نہیں بلکہ خودکشی کرنے والوں کے ظرف کا قصور رہے۔ اس کے علاوہ اگر غور کریں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسرت پرستی کا جذبہ ہی ہے جو انسان کو خودکشی کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ مسرت کو زندگی کا مقصد سمجھنے والا انسان جب اپنے مقصد سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کو بے قیمت سمجھ کر اس کا خاتمہ کرنے پر تُل جاتا ہے لیکن جو لذت غم سے واقف ہے وہ زندگی کو رب کی نعمت سمجھ کر اسے ہر گام پر سنوارنے کی کوشش کرتا ہے۔ فانیؔ کا غم دراصل ان کی آپ بیتی ہے جس کو وہ فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں۔ غم پر آنسو بہانا ایک فطری عمل ہے۔ جب فانیؔ کو غم سے واسطہ پڑا تو ان کا یہ احساس جلا پا گیا۔

قاضی عبدالغفار فرماتے ہیں کہ ''غم کے جذبات میں جو شدت اور گہرائی ہوتی ہے وہ خوشی میں نہیں۔ اکثر اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ خوشی کی لہریں ہماری ذات کی اوپری سطح ہی کو متاثر کر رہی ہیں یا صرف ہمارے ظاہر کو چھو رہی ہیں۔ لیکن غم ہماری روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور ہماری کل ہستی کو متاثر کرتا ہے۔ غم ایک پائندہ حقیقت ہے اور خوشی ایک آنی جانی چیز۔ غم اس باغ ہستی کا مستقل رنگ ہے اور مسرت ایک عارضی بہار۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز

خوشی اور مسرت کے عارضی وقتوں کے بعد بار بار اپنے اصلی رنگ ہی کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر اقدار اور تناسب کے اعتبار سے بھی غور کیا جائے تو خوشی صرف چند خوش نصیبوں کے حصہ میں ملے گی۔ باقی انسانوں کی وسیع اکثریت غم واندوہ سے ہم کنار نظر آئے گی۔'' اسی طرح پروفیسر عبدالشکور فانیؔ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ''فانیؔ کا کلام پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک غضب کا اداکار اسٹیج پر کھڑا ہے اور اس کے پیچھے پردہ دنیا کی رنگا رنگی نقش ہے۔ زندگی کی ہر شان و حالت نظر آتی ہے۔ مغموم کے نالے اور مسرور کے ترانے، حسن کی رعنائی اور محبت کی رسوائی، غریب کی بے بسی اور تونگر کی بے دردی، مگر اداکار ہے کہ تماشائی کو اپنے سوا کسی دوسری طرف نظر اٹھانے کی فرصت ہی نہ دیتا، اس کا اپنا شیون اس قدر دلکش ہے اور اس کا فسانۂ غم اتنا طویل کہ نہ وہ خود کسی طرف التفات کرتا ہے نہ دوسروں کو اتنی مہلت دیتا ہے۔ آپ فانیؔ کی کوئی غزل پڑھیے، صرف فانیؔ آپ کے سامنے ہوں گے۔ اور ساری دنیا نظر سے اوجھل۔''

ان کی شاعری خاص طور سے اسی غم کے نظام اور مختلف جذبات کی تصویر کشی کرتی ہے۔ وہ غم دنیا کو اہمیت نہیں دیتے، وہ اسے ناپائدار مانتے ہیں۔ فانیؔ اس 'دنیائے فانی' کی ناپائداری کو سمجھتے ہیں۔ اردو میں فانیؔ بدایونی قنوطی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس دنیا کے جبر اور ہستی کی حقیقت کو تلاشنے کی کوشش کی ہے۔ ہستی کی بنیاد عشق ہے اور جب جذبۂ عشق بیدار ہو جاتا ہے تو جبر اور غم رضا وشکر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک عشق اور دوسرا غم جو لازمۂ عشق ہیں۔ ایک کے باعث تجربات حاصل ہوتے ہیں اور دوسرے کی وجہ سے اس میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فانیؔ کی شاعری میں اخلاقی تصورات کے باعث شعر میں طہارت، پاکیزگی اور نکھار پیدا ہوا۔ اور جس نے شعریت کو بھی مجروح ہونے سے بچائے رکھا۔ فانیؔ نے کس سادگی سے ان جذبات کو بیان کیا ہے۔

عشق ہے پرتوئے حسنِ محبوب
آپ اپنی ہی تمنا کیا خوب

.....

با خبر ہے وہ سب کی حالت سے
لاؤ ہم پوچھ لیں نہ حال اپنا

.....

اسیر بند دل ہو کر غمِ دنیا سے فارغ ہوں
مری آزادیوں کا راز ہے مجبور ہو جانا

.....

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر
ہمت ہو تو پے قرار ہو جا

.....

چن لیا تیری محبت نے مجھے
اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

فانیؔ نے اپنی شاعری میں مختلف تراکیبیں استعمال کیں اور ایسے اسلوب کا استعمال کیا جس میں لطافت بھی ہے، تاثیر بھی اور ترنم بھی۔ ان کی شاعری میں ہمیں صوتی آہنگ نظر آتا ہے۔ فانیؔ اپنی زندگی میں حقیقت کو تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے زندگی کے تضادات کو اپنے داخلی تجربے میں سمیٹ کر اپنے وجدان سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس دنیائے فانی کے یہ تضادات ایک ہی اصل کے دو پہلو ہیں۔ انسان کے افکار ونظریات اور احساس کی تبدیلی کی حقیقت کے بارے میں بھی فانیؔ غور وفکر کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں تشبیہات اور استعارات کا بھی بخوبی استعمال کیا۔ جب ہم فانیؔ کو پڑھتے ہیں تو ان کی آواز اپنے کیف وغم کے ساتھ ہمارے کانوں میں بجتی اور دل میں اتر جاتی ہے۔ فانیؔ کا لہجہ بیانیہ نہیں، جذباتی ہے۔ اس میں جذبے کی خود اظہاریت ہے۔ اس لہجہ میں شخصیت کا جو رنگ گھلا ہوا ہے وہ کبھی نہیں بدلتا۔ فانیؔ کو پڑھتے ہوئے ہم ان کے اظہار جذبات کے مختلف طریقوں سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ غم وغصہ کا اظہار کس طرح کرتے ہیں۔ شکایت کا انداز کیا ہے۔ خوشی اور مسرت کے جذبات لہجہ میں کس طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان تمام جذبات اور کیفیات کے ساتھ ان کا لہجہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ دنیا اور کائنات میں اپنی ذات کا تشخص کس طرح کرتے تھے۔ فانیؔ کے لہجے سے ان کی شخصیت کی تصویر ہمارے ذہن میں بنتی ہے۔ یہ شخصیت شوکت علی خاں کی نہیں بلکہ فانیؔ کی شخصیت ہے جو شوکت علی خاں کی بازیافتہ شخصیت ہے۔ شخصیت کی یہ تصویر قاری کو آئینہ دکھاتی ہے جس میں وہ اپنا سراپا دیکھتا ہے۔ شعری ابلاغ کی یہ وہ منزل ہے جہاں قاری اور شاعر میں فرق باقی نہیں رہتا۔ شاعر کے جذبات قاری کے جذبات بن جاتے ہیں۔

بہرحال ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے شعراء کا جب بھی ذکر ہوگا تو فانیؔ بھی یقیناً اس فہرست کی زینت بنیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام میں ندرت، انداز میں انوکھا پن، جذبات میں خلوص اور بیان میں سنجیدگی ہے۔ فانیؔ ایسے گنے چنے شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو پستی سے ہی نہیں نکالا بلکہ غزل کو آبرو بھی بخشی اور اس میں لطافت بھی پیدا کی۔

فانیؔ نے اپنی شاعری میں نادر تشبیہات واستعارات اور دنیا و حیات کے مختلف جذبات و احساسات بیان کر کے اردو شاعری کو نئی جہت بخشی اور نیا رنگ عطا کیا۔ جس سے اردو دنیا آج بھی محظوظ ہو رہی ہے۔

□□□

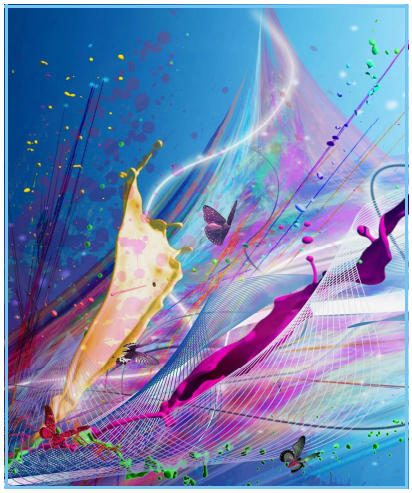

انمول تجارت

پروفیسر افسانہ خاتون

صدر شعبۂ اردو

جے ڈی ویمنس کالج

پٹنہ (بہار)

رابطہ: 7319879539

کریم چچا سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اچھی خاصی پنشن پاتے تھے، خرچ بھی کوئی خاص نہیں تھا، خاندان بھر میں بہت مقبول بھی تھے۔ کسی نہ کسی زاویے سے چرچا کا موضوع بنے رہتے۔ بھرا پرا خاندان تھا اور تقریباً سبھی لوگ برسرروزگار تھے، کچھ کاروبار میں بھی تھے، یعنی خوشحال گھرانہ تھا، مگر پتہ نہیں کیوں ابا، اماں دوسرے بزرگوں کے درمیان کبھی کبھی بات ہوتی رہتی کہ کریم چچا مالی پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ باتیں اس قدر دھیمی اور رازدارانہ انداز میں ہوتیں کہ بہت کان لگانے کے بعد بھی پوری بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی، مگر جو بھی آتی تھی، اس سے تعجب ضرور ہوتا تھا کہ کریم چچا کیسے پریشان ہو سکتے ہیں، ان کا تو کوئی ایسا خرچ بھی نہیں۔ ممکن ہے دواعلاج میں کچھ پیسے زیادہ اٹھ جاتے ہوں، بظاہر وہ صحت مند بھی تھے، اس لئے اس میں بھی زیادہ خرچ ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ پھر کیا بات تھی جو کچھ بزرگوں کو کبھی کبھی تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

کریم چچا کی مقبولیت کی وجہ ان کی سخاوت بھی تھی۔ وہ کہیں، کسی کے گھر بھی جاتے تو خالی ہاتھ کبھی نہیں جاتے تھے۔ موقع مصلحت کی مناسبت سے کبھی پھل، کبھی مٹھائی، کبھی کوئی اور چھوٹا موٹا تحفہ ان کے ہاتھوں میں ضرور ہوتا۔ بچے تو ان کے دلدادہ تھے۔ وہ نہ صرف اپنی جیبوں میں ٹافی بھرے رہتے بلکہ ان کے آنے پر اگر آئس کریم والا آواز لگاتا یا اپنے ڈبے کو پٹک کر اپنی آمد کی اطلاع دیتا تو وہ سب بچوں کو آئس کریم بھی کھلاتے۔ کبھی کبھی آئس کریم کی دعوت عام میں بڑے بھی شریک ہو جاتے۔ یوں اپنی مقبولیت کے گراف کو نہ صرف قائم رکھنے بلکہ اسے اونچا کرتے رہنے کے انہیں بہت سے گر آتے تھے۔ فطری بات تھی کہ ان کے سلسلے کی کسی بات سے بھی ہم لوگوں کو غیر معمولی دلچسپی ہوتی۔ ان کے خوش ہونے سے ہم لوگ خوش ہوتے اور ان کے رنجیدہ ہونے یا کسی تکلیف کی خبر سے ہم لوگوں پر بھی یاس چھا جاتا۔

اس دن پہلی بار ہماری سمجھ میں آیا کہ ابا اور اماں کو ان کے بارے میں تشویش کیوں ہے۔ دراصل کریم چچا، گاؤں میں اپنی خاندانی زمینوں کو آہستہ آہستہ فروخت کر رہے تھے، اس کی ضرب ابا کے کھیتوں پر بھی پڑ رہی تھی۔ یہ کریم چچا کا ذاتی معاملہ تھا، ان سے کسی کو پوچھنے کا حق ہی نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ کریم چچا ان پیسوں کا کیا کرتے تھے، یہ پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ اپنے سارے فرائض سے فراغت پا چکے تھے۔

اپنے بچوں کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی، اور وہ سب بہت خوشحال بھی تھے۔ خود کریم چچا کے ہاتھوں میں ایک معقول رقم پنشن کی صورت ملتی تھی۔ پھر وہ کہاں اور کیسے خرچ کرتے تھے؟ ابا اور اماں کا فکرمند ہونا لازمی تھا۔ وہ اندر اندر کڑھ رہے تھے۔ وہ کریم چچا سے صاف صاف پوچھ بھی نہیں سکتے تھے اور یہ پتہ لگانا بھی ان کے لئے بہت مشکل تھا کہ آخر وہ ان پیسوں کو کہاں خرچ کرتے ہیں۔

مجھے بھی اس کا تجسس ہوا۔ میں کریم چچا سے قریب بھی تھا۔ اگرچہ یہ ہمت میری بھی نہیں تھی کہ میں براہ راست ان سے کچھ پوچھوں۔ جب میرے بڑے نہیں پوچھتے تو میں کس گنتی میں تھا۔ پھر بھی ایک ترکیب مجھے سوجھ گئی۔ اگر میں تھوڑا وقت ان کے ساتھ بسر کروں تو شاید یہ راز کھل جائے۔ کریم چچا باتونی بھی بہت تھے۔ وہ اپنی کوئی بات دل میں نہیں رکھتے تھے۔ پھر بھی یہ ممکن ہے کچھ ضروری باتیں وہ اپنے دل میں بھی رکھ لیتے ہوں۔ میں کوشش کروں تو شاید مجھے کامیابی مل جائے۔ میں کامیاب ہو گیا تو خاندان بھر کے ٹینشن کو دور کرنے کا سبب بن جاؤں گا۔ کریم چچا کے ہاں میرا آنا جانا تو تھا مگر کبھی کبھی۔ شاید میں باقاعدگی سے جانا شروع کروں گا تو کریم چچا یقینا شک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ وہ یوں بھی کافی ہوشیار اور چاق و چوبند تھے۔ اپنے بارے میں کسی کو زیادہ بھنک نہیں لگنے دیتے تھے۔ ویسے یہ معاملہ کوئی بہت ہی راز و نیاز کا نہیں تھا، بس لوگوں نے بنا دیا تھا۔ کریم چچا اپنے پیسے خرچ کرتے تھے، اپنی جائیداد بیچ رہے تھے۔ اب وہ خرچ کہاں کرتے تھے، اس سے دوسروں کا کیا واسطہ، مگر واسطہ بن گیا تھا۔

دوسرے دن کالج سے لوٹتے وقت میں نے کچھ جامن خرید لئے، جو انہیں بہت پسند تھے اور ان کے ہاں چلا گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔

''ارے بیٹا، تم آئے، بہت خوشی ہوئی، مگر جامن لانے کی کیا ضرورت تھی.....؟''

میں نے جواب دیا۔

''راستے میں بک رہے تھے، میں نے سوچا، آپ کے لئے لے لوں، آپ کو بہت پسند ہیں نا.....''

انہوں نے خوش ہو کر مجھے تقریباً لپٹا لیا۔

''بیٹا، تم نے میرا خیال رکھا، جی خوش کر دیا۔ خدا تمہیں دن دونی، رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، دین و دنیا دونوں میں سرخ روئی نصیب فرمائے.....''

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی محبتوں اور پیار کی کتنی بارشوں سے مجھے شرابور کر دیں۔ سب سے پہلے تو انہوں نے حکم صادر کیا کہ مجھے کھانا کھا کے جانا ہوگا۔ پھر انہوں نے باورچی کو بلا کے میری پسندیدہ چیزیں مجھ سے پوچھ پوچھ کر اسے بنانے کو کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ کریم چچا ریٹائر ہو چکے ہیں اور گھر بار کی ذمہ داری ان کے بیٹے اور بہو کی ہوگی۔ پھر بھی ان کا حکم سب پر بھاری تھا۔ اتنی دیر میں ان کی بیوی یعنی میری چچی بھی آ گئیں اور انہوں نے بھی میرے آنے پر خوشی کا اظہار کیا، بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ میں برابر آجایا کروں، تمہارے آنے سے تمہارے چچا کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔

ان کے حوصلہ افزا جملوں سے میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں نے سوچ لیا کہ اب چچا کے ہاں اکثر آجایا کروں گا۔ کریم چچا میرے آنے سے ہمیشہ بہت خوش ہوتے اور میری خاطر تواضع میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ایسا لگتا جیسے میں آج پہلی بار ان کے یہاں آیا ہوں، ان کے اس بے پناہ سلوک سے مجھے شرمندگی ہوتی اور میں ان سے کہتا کہ چچا، آپ بار بار میری اتنی خاطر کرتے ہیں، مجھے اچھا نہیں لگتا، ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی غیر ہوں۔ وہ میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتے۔

''ایسا کبھی مت سوچو گے بیٹا، تم روز بلکہ ہر وقت آؤ، تب بھی مجھے اتنی ہی خوشی ہو گی۔ میاں، تمہارے آنے سے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ قیمتی چیز پالی ہے۔ جانتے ہو، یہ قیمتی چیز کیا ہے؟''

میں ان کا منہ تکنے لگتا۔ وہ ہنستے ہوئے کہتے۔

''میاں یہ چیز محبت ہے، جو اب اتنی گراں ہے کہ آسانی سے کسی کو نہیں ملتی، اس کو حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے.....''

میں پوچھ بیٹھا۔

''وہ کیسے چچا.....؟''

وہ بڑے سہج سے جواب دیتے۔

''وہ یوں کہ دنیا کی کوئی چیز بھی محنت و مشقت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اس کے لئے اپنے آپ کو اور بہت سی چیزوں کو خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اب تم ہی پڑھ رہے ہو، محنت کر رہے ہو، تبھی تو کچھ حاصل کر سکو گے۔ تم مشقت اٹھا کے میرے پاس آتے ہو تو اپنے ساتھ وہ چیز لاتے ہو جس کے بارے میں شاید تم بھی نہیں جانتے..... میاں وہ چیز محبت ہے جو تم آتے ہی میرے حوالہ کر دیتے ہو اور میں مالا مال ہو جاتا ہوں۔''

چچا اس قدر جذباتی ہو جاتے کہ ان کی آنکھوں میں چمکتے موتی جھلملانے لگتے۔ ان کی باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتیں، مگر میرے لئے ان کے محبت بھرے جذبات کے آگے سر جھکا دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا تھا۔

کریم چچا اپنے ذاتی کام بھی میرے حوالہ کر دیتے حالانکہ اس کے لئے وہ بار بار معافی بھی مانگتے اور میں شرمندہ ہوتا رہتا۔ ایک بار تو میں نے کہہ دیا کہ چچا آپ مجھے غیر سمجھتے ہیں تب تو ایسا کرتے ہیں۔ آخر آپ اپنے بچوں سے تو کام کرانے کی پیشگی معافی وافی تو نہیں مانگتے ہوں گے۔ انہوں نے وفور جذبات سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بولے۔ ''میں تمہیں اپنے بچوں سے ہرگز کم نہیں سمجھتا، مگر میرے بچے گھر میں رہتے ہیں، تم تکلیف کر کے باہر سے آتے ہو تو کیا میں بے شرم کی طرح تمہیں اپنا کام سونپتا رہوں.....''

میں نے جواب دیا ''پھر بھی آپ مجھ سے

معافی نہیں مانگا کریں، مجھے تو اچھا نہیں لگتا.....''

وہ ہنس پڑے۔ ''چلو پھر ٹھیک ہے، تمہیں اچھا نہیں لگتا تو میں ایسا کام نہیں کروں گا.....''

چچا کے ذاتی کام بھی کیا تھے۔ کبھی ڈاک خانے سے اپنے پوتوں، نواسیوں کو پیسے بھیجنا، کبھی کوریئر سروس سے ان کے لئے کچھ تحفے تحائف، کبھی بازار سے پھل، مٹھائی، چاکلیٹ، وغیرہ لے آنا۔ کبھی کبھی وہ مجھے ساتھ لے کر مارکٹنگ کے لئے بھی نکل جاتے۔ مجھے اکثر تعجب ہوتا کہ چچا ابھی تک اپنے گھر بار کی ساری ذمہ داریاں کیوں اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کے بچے اپنے بال بچوں کی ضرورتوں کو دیکھیں۔ چچا تو ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، انہیں تو اب صرف آرام کرنا چاہئے یا پر سکون، ٹھنڈی جگہوں کے سیر سپاٹے کے لئے نکل جانا چاہئے۔ انہیں اچھی خاصی پنشن ملتی ہے۔ اس کا مطلب ہے، اپنی پنشن کے پیسے وہ ان ہی پر خرچ کرتے ہیں۔ میرے والد اور والدہ کو ان کے جائداد بیچنے کے سلسلے میں جو تشویش ہے، وہ گویا واجب ہے۔ یہاں آکر میری پالکی بھی رکھا جاتی تھی۔ ان سے یہ باتیں پوچھے کون، جب میرے ماں باپ اس کی ہمت نہیں کر سکے تو میری کیا اوقات تھی۔ زیادہ سے زیادہ میری معلومات میں یہی اضافہ ہوا تھا کہ وہ پیسے اپنے گھر کے بچوں ہی پر خرچ کرتے ہیں، ادھر ادھر نہیں۔ میں نے اپنے ماں باپ کو بھی اس کی جانکاری دی تو وہ کہنے لگے کہ اتنا اندازہ تو انہیں بھی تھا، مگر سوال یہ ہے کہ وہ کیوں سب کے لئے تکلیف برداشت کر رہے ہیں۔ آخر ان کے بچے ان ذمہ داریوں کو کیوں پورا نہیں کرتے یا پھر یہ انہیں پورا نہیں کرنے دیتے۔

میں کریم چچا سے اتنا قریب ہو گیا تھا کہ مجھے یہ توقع تھی کہ اگر میں ان سے کچھ پوچھوں تو شاید برا نہیں مانیں گے۔ پھر بھی اس کے لئے مناسب ترین وقت کا انتخاب بہت ضروری تھا، ایسا نہ ہو کے چچا اس سوال پر برا مان جائیں۔ تھا تو یہ سو فی صد ذاتی سوال، پھر وہ بہت مصروف بھی رہتے تھے، بے موقع ان سے ایسے سوال کرنا مصلحت کے موافق نہیں ہوتا۔ پھر ان کا موڈ دیکھ کر ہی کچھ پوچھا جا سکتا تھا، یوں کریم چچا خاصے خوش مزاج آدمی تھے۔ اگرچہ ایک عمر کو پہنچ گئے تھے مگر ان میں بوڑھوں والی چڑچڑاہٹ بے زاری وغیرہ نام کو بھی نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کسی قسم کی بیماری میں مبتلا نہیں تھے۔ اس عمر میں تو ریٹائرمنٹ کے پیسے دوا علاج ہی پر خرچ ہوتے ہیں، کریم چچا خوش قسمت تھے کہ بیماری وغیرہ پر ان کے پیسے خرچ نہیں ہوتے تھے۔

اگر کوئی باہر کا فرد ان کے گھر آجاتا تو اسے ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ کریم چچا ایک ریٹائرڈ ہستی ہیں۔ چاق وچوبند اور صحت مند ہونے کے علاوہ ان کی سرگرمیوں سے ان کی بھرپور اور مصروف زندگی کا پتہ چلتا تھا۔ ان کے بچے بڑے بڑے اور اپنی اپنی جگہ پر مطمئن تھے۔ مگر گھر پر حکمرانی کریم چچا ہی کی چلتی تھی۔ میں موقع کی تلاش میں تو تھا ہی، قسمت نے ایک سنہری موقع عطا کر دیا۔ ہوا یہ کہ انہیں اپنے کسی عزیز کو فوری طور پر کچھ پیسے بھیجنے تھے اور شاید اتنے پیسے ان کے پاس نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے والد سے اتنے روپے قرض کے طور پر مانگ کر لے آؤں، وہ اگلے ہفتے ادا کر دیں گے۔ پیسے تو میں فوراً لے آیا، مگر میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ میں نے دبی زبان سے عرض کیا۔

''چچا، آپ ان کے لئے کیوں پریشان ہیں۔ آخر ان کے والدین بھی تو ہیں.....''

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نہیں ابھریں۔ کچھ سوچ کر مسکرائے، پھر بولے۔

''اصل میں، میں تجارت کرتا ہوں بیٹے۔ اس تجارت میں، میں اپنے بیٹوں کو بھی دخل نہیں دینے دیتا۔''

''تجارت.....؟!''

میں بھونچکا سا ان کا منہ تکنے لگا۔ وہ ہنس پڑے۔

''یہ لین دین ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بس یہ سمجھ لو کہ چند بہت قیمتی چیزوں کے حصول میں، میں اپنا پیسہ لگاتا ہوں اور اس میں مجھے بھرپور کامیابی مل رہی ہے.....''

کریم چچا کی بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے اندر سوالوں کی ایک سبیل کھل گئی تھی جس میں سوال پر سوال نکل رہے تھے۔ مگر اپنے سبھی سوالات کو چچا پر بے تحاشہ انڈیل دینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی ایک بہت اہم اور قدرے تیکھا سوال میری زبان سے نکل ہی گیا۔ ہچکچاتے ہوئے انداز میں، میں نے پوچھا۔

''لیکن..... چچا، میں نے تو سنا ہے کہ آپ اپنی جائیداد بیچ رہے ہیں۔ آپ کو اپنی تجارت میں نفع ہو رہا ہے تو آپ کو تو جائیدادیں خریدنا چاہئے تھیں؟''

اس دفعہ وہ قہقہہ مار کے ہنسے۔

''ہاں، یہ تم نے بہت خوب پوچھا۔ یہ سوال تو میرے بھائی بندوں کے ذہن میں بہت دنوں سے کلبلا رہا ہے، مگر وہ تمہاری طرح باہمت نہیں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ٹینشن میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھ لیتے تو انہیں سکون میسر ہو جاتا۔ تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں اپنی تجارت میں جو کچھ حاصل کرتا ہوں، وہ دوسروں کو شاید نظر نہیں آتا، یوں وہ کوشش کرتے تو انہیں ضرور دکھائی دے دیتا۔ بیٹا، میں خوشیاں اور سکون خریدتا ہوں، یہ ایسی قیمتی

چیزیں ہیں جو میری دولت کا بدل بھی نہیں ہو سکتیں۔ بس میں ہی ان کی اہمیت اور قیمت جانتا ہوں۔ میرے کمائے ہوئے پیسے اور میری خاندانی جائیداد اور دولت میرے کس کام کی جب میں ان کا مصرف ہی نہ اٹھا سکوں.....''

کریم چچا آگے بھی کچھ بولتے رہے، مگر میں مبہوت سا بس انہیں دیکھتا رہ گیا۔

□□□

خالی پنجرہ

سلمیٰ حجاب

3/32

وپل کھنڈ، گومتی نگر

لکھنؤ

رابطہ: 9125106327

آج پھر وہی ہوا۔ دائیں جانب کی سڑک سے آنے والی کار تھم گئی، اور کبوتروں کا جھنڈ ٹھک ٹھک کر چلتے ہوئے سڑک پار کرنے لگا، دو دو تین کی قطاروں میں آگے پیچھے ہو کر وہ اپنی مستانہ چال سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ کسی نے ان کے سفر کے احترام میں اپنا سفر روک دیا ہے، اور بغیر ہارن بجائے، ایک خاموش تماشائی کی صورت اسٹیرنگ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔ ان کا کارواں گزر جانے کا انتظار کر رہا ہے۔

میں کثیر منزلہ عمارت کی تیسری منزل کی بالکنی سے یہ منظر تیسری یا چھوتی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔ اسی عمارت کے داخلی گیٹ کے اطراف میں بنے وسیع چبوترے کے ایک کونے میں بکھرے گیہوں کے دانوں میں ملے ہوئے کچھ سفید دانے بھی چمک رہے تھے۔ اسی چمکتے ہوئے رزق نے کبوتروں کے غول کو دعوت دی تھی۔ مجھے نہ تو ان بکھرے ہوئے دانوں پر تعجب ہو رہا تھا، نا ان کبوتروں پر حیرت اس بات پر تھی کہ جو پرندے اڑ سکتے تھے، وہ چل کر سڑک پار کر رہے تھے۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ انسان اتنا مہذب، صابر، اور باادب کیوں اور کیسے ہو گیا، کہ وہ اپنے پرواز کرتے ہوئے وقت کو ان پرندوں پر قربان کر رہا ہے، جو اڑنے کے بجائے سڑک پر چل رہے تھے، میں جانتی تھی کہ ہارن نہ بجانا دوبئی کے ٹریفک اصولوں میں شامل ہے رہائشی علاقہ تھا لہذا کار کی رفتار پر بھی کنٹرول تھا۔ میں حیران تھی کہ یہ سرمئی خوبصورت پرندے گلابی مائل نازک پنجوں پر اپنی گردن کو پیچھے کی طرف اکڑائے ہوئے، سینے فخر سے پھلائے ہوئے چل کر سڑک کیوں پار کرتے ہیں۔ چبوترے کے قریب پہونچتے ہی ہلکی سی اڑان بھر کر دانوں کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے سوچا یہ کبوتر خواہ کتنے معصوم اور بے ضرر کیوں نہ ہوں، انسان اپنی شرافت میں آج ان سے بازی مار لے گیا، آج ہی کیوں پچھلے دو ہفتوں میں، میں نے یہ منظر تیسری بار دیکھا تھا، اور آج بھی حیرت و مسرت کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھی جس نے میری فکر کے نگارخانے میں ایک خوبصورت نقش چھوڑا تھا، زندگی کا حسن ابھی باقی ہے، وقت کا پرندہ پرواز کرتے کرتے اکثر پل بھر کے لئے ٹھہر کر اپنے خوبصورت رنگین پروں کی جھلک دکھلا کر ایک لمحے کے لئے ہی سہی ہمیں مسحور کر لیتا ہے، میں اس سحر زدہ لمحے کا حسن اپنی زندگی کی تصویر میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھی کہ بیٹی کی آواز نے چونکا دیا، ممی، آیئے چائے تیار ہے، میں بالکنی کا دروازہ بند کر کے کمرے میں آ گئی۔

شیشے کے دروازے سے مجھے سامنے کی عمارتیں بالکل صاف نظر آرہی تھی ،شام کے سائے جب گہرے ہونے لگے تو زمین پر پھدکتے اور وہیں پر اڑتے کبوتر ایک کے بعد ایک پرواز کر کے عمارت کے پچھلے حصے میں کھڑکیوں سے لٹکے ہوئے کھلے بکسوں میں پناہ لینے لگے۔ میں نے اشارہ کر کے بیٹی سے کبوتروں کے اس پناہ گاہ کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔میری دلچسپی پر ذرا جرات کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔''ارے ممی اس ہیگنگ باکس میں ،اے۔سی رکھا جاتا ہے، سامنے والا فلیٹ خالی ہے، اس لئے اس میں اے سی نہیں بلکہ اس میں آپ کے پیارے کبوتر ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں ، کبوتروں کے آشیانے کے متعلق میرے تجسس کو دیکھ کر وہ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگی،''ممی یہاں تو روز فلیٹ خالی ہوتے ہیں روز آباد ہوتے ہیں'' اور ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

میرے دل کی گہرائیوں میں کہیں ایک ٹیس سی ابھری ، فلیٹ آباد ہوتے ہیں تو یہ پرندے خانماں برباد ہوجاتے ہیں، بیچارے معصوم بے زباں اور بے ضرر رب کبوتروں کی معصومیت مجھے ہمیشہ بڑی پرکشش لگتی تھی میرے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ یہ کبوتر اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جنھیں کبوتروں میں اللہ نے انسانوں کی حفاظت کے لئے اتارا ہے۔ ہمارا عقیدہ تو یہی ہے نا کہ ہر انسان کی حفاظت کے لئے پروردگار نے دو دو فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔اپنی فرصت کے اوقات میں، میں آج کل ان معصوم فرشتوں اور انسان کے روحانی رشتے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کسی نتیجے پر پہونچنے سے قاصر تھی۔ اپنے ملک کے چھوٹے بند مکانوں میں تو میرا سابقہ ان کبوتروں سے ہوتا نہیں تھا۔ ناہی وہاں کے باشندے اتنی فراخدلی کے ساتھ پرندوں کی غذا کا انتظام کرتے تھے، وہاں تو انسانوں کی بھی اپنے محدود وسائل میں سمٹ کر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

اپنے سمٹے ہوئے پنکھوں کو پھیلانے اور اپنے

اطلاع

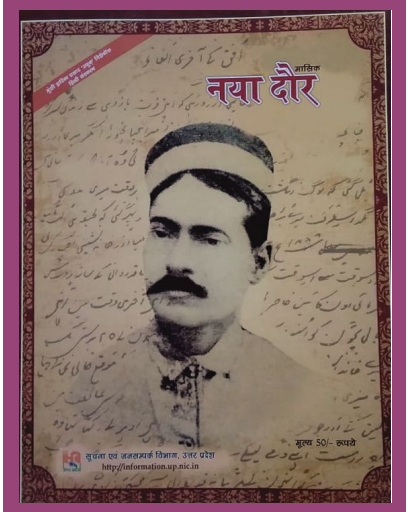

ادارہ'' نیادور'' کی جانب سے شائع ہونے والے ''خمار بارہ بنکوی'' اور ''منشی دوار یکا پرشاد افق لکھنوی'' نمبر اب دیوناگری رسم الخط میں بھی دستیاب ہیں۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۵۰؍روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰؍روپے ملا کر کل قیمت ۱۰۰؍روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

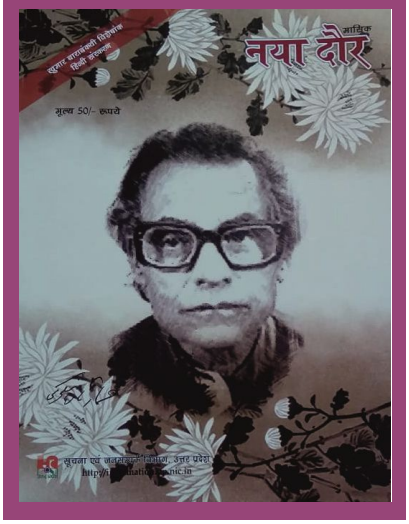

مشاہدے کو وسیع کرنے کی خواہش مجھے دوبئی کھینچ لائی تھی، میری بیٹی نوشین کا فلیٹ عمارت کے تیسرے فلور پر تھا جس میں تین کمرے تھے، تینوں کمروں کی کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے تھے، جن سے اطراف کے نظارے بالکل صاف دکھائی دیتے تھے، بالکنی سے دو طرف کی سڑکیں، ایک تراہا اور عمارت کے داخلے پر بنے پلیٹ فارم بھی نظر آتے تھے، دائیں، بائیں اور سامنے، تین اطراف کے نظارے اپنی خاموش زبان میں مجھ سے کچھ کہتے رہتے تھے۔ اس خاموش گفتگو کے جواب میں میری فکر ونظر کے نئے زاویئے نئے پہلو پرورش پا رہے تھے، میں نے دیکھا کہ دوبئی کی زندگی بہت مصروف ہے ، ہر لمحہ رواں دواں ہے، مگر شورشوں سے دور بلندیوں کی طرف کبوتریں مسلسل پرواز کر رہی ہے اور زمین سے دور ہوتی جارہی ہے۔ فلیٹ کی کھڑکیوں سے سب کو اپنے حصے کا آسمان نظر آجاتے تھے، مجھے لگتا تھا، جیسے کہ انسانوں کو دانہ پانی دیکر خلاؤں میں معلق ان پنجروں میں قید کر دیا گیا ہو۔

ان کو بس اتنی دیر کے لئے رہائی ملتی ہے، کہ وہ ان پنجروں میں قید کر دیا گیا ہو۔ ان کو بس اتنی دیر کے لئے رہائی ملتی ہے، کہ وہ زمین کے مخصوص حصے میں اپنا رزق تلاش کریں اور واپس اپنے پنجرے میں آجائیں، کبوتر ان کی زمین پر چہل قدمی اور محدود پرواز کے مسلسل مشاہدوں نے شاید میری فکر کو بھی اسیر کر لیا تھا اور میں انسانی زندگی کو بھی پرندوں کے مخصوص طرز عمل کے دائروں میں رکھ کر سوچ رہی تھی، میری اس خاموش فکری کاوش پر اکثر میری بیٹی پہرہ بٹھا دیتی تھی،''ممی کیا بات ہے۔؟ یہاں آیئے ۔ میرے ساتھ ٹی وی دیکھئے ، ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہیں'' اور مجھے نا چاہتے ہوئے بھی بیٹی کی پسندیدہ مشغلے میں شریک ہونا پڑتا تھا۔

اگلے دن جمعہ تھا یعنی چھٹی کا دن، اس دن شام کو آؤٹنگ کرنا میری بیٹی داماد کے روٹین میں شامل تھا۔ پروگرام میں تھوڑی تبدیلی کر دی گئی آج پہلے ساحلی

علاقہ یا عرف عام میں جسے پاش علاقہ کہتے ہیں کے اطراف میں لانگ ڈرائیو اور سائٹ seeing کا پروگرام تھا، میری بیٹی کو علم تھا کہ مجھے فطری مناظر دیکھنے کا بیحد شوق ہے۔ کار کی اسپیڈ کو اسی لئے کم رکھا گیا تا کہ میں ہر سین کو اچھی طرح دیکھ لوں، تھوڑی ہی دور کی ڈرائیو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ منظر حسین تو ہیں لیکن یہ حسن اپنے فطری روپ میں نہیں ہے بلکہ یہاں کے خوبصورت نظاروں میں انسان کے دست ہنر کی مہر لگی ہوئی تھی۔ سمندر کے کھارے پانی کو میٹھا بنا کر پیاسے صحرا کو گلشن کی طرح سرسبز و شاداب بنالیا، بدلتے منظر نامے میں اچانک ایک سین نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، میرے منہ سے بے ساختہ ''ارے۔'' نکل گیا، ''کیا ہوا ممی۔'' نوشین اور جاوید نے ایک ساتھ سوال کر دیا۔

''ہوا کچھ نہیں۔ حیران ہوں۔ کہاں وہ کثیر منزلہ عمارتوں کا جال اور کہاں یہ وِلاز'' یہ مکان تو ہمارے ملک کے مکانوں کی طرح بنگلے نما ہیں، باونڈری، اس کے اندر سبزلان۔ اس کے بعد پختہ برامدے، اس کے عقب میں خوبصورت پتھروں کے مکان!

''یہ کس کے مکانات ہیں۔ جاوید!''

''ممی یہ مکان دوبئی کے شیخوں کے ہیں۔'' جاوید اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گئے، لیکن میرے دماغ میں ہلچل مچی تھی۔ ''یہاں کے سیٹھ ملٹی اسٹوری بلڈنگ میں نہیں رہتے کیا۔؟'' جاوید نے انکار میں اپنی گردن ہلادی۔

''ارے بھئی جو بلند و بالا عمارتیں دوبئی کی شان بھی ہیں اور شناخت بھی۔ ان کے مالکان ان سے دور الگ گھروں میں رہتے ہیں۔ حیرت ہے۔؟

''ممی میں بتاؤں۔'' میری بیٹی نوشین کو شاید میری کم علمی پر خجالت کا احساس ہو رہا تھا۔ ان عمارتوں میں تو زیادہ تر نوکری پیشہ لوگ رہتے ہیں، دوسرے ملکوں سے آنے والے جو ملازمت کے سلسلے میں یہاں عارضی طور پر قیام کرتے ہیں۔ ممی میں آپ کو بتاؤں کہ بڑی بڑی بزنس کمپنیاں اکثر پوری پوری بلڈنگ کرائے پر لے لیتی ہے، اور اپنے ملازمین کو رہائش کے لئے دیتی ہیں۔ عارضی طور پر۔''

''مطلب۔''

یہ جب تک نوکری ہے تب تک فلیٹ بھی ہے۔ کمپنی کی نوکری چھوڑی تو فلیٹ بھی چھوٹا۔ پھر دوسری

اگلے دن جمعہ تھا یعنی چھٹی کا دن، اس دن شام کو آؤٹنگ کرنا میری بیٹی داماد کے روٹین میں شامل تھا۔ پروگرام میں تھوڑی تبدیلی کردی گئی آج پہلے ساحلی علاقہ یا عرف عام میں جسے پاش علاقہ کہتے ہیں کے اطراف میں لانگ ڈرائیو اور سائٹ seeing کا پروگرام تھا، میری بیٹی کو علم تھا کہ مجھے فطری مناظر دیکھنے کا بیحد شوق ہے۔ کار کی اسپیڈ کو اسی لئے کم رکھا گیا تا کہ میں ہر سین کو اچھی طرح دیکھ لوں تھوڑی ہی دور کی ڈرائیو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ منظر حسین تو ہیں لیکن یہ حسن اپنے فطری روپ میں نہیں ہے بلکہ یہاں کے خوبصورت نظاروں میں انسان کے دست ہنر کی مہر لگی ہوئی تھی۔ سمندر کے کھارے پانی کو میٹھا بنا کر پیاسے صحرا کو گلشن کی طرح سرسبز و شاداب بنالیا، بدلتے منظر نامے میں اچانک ایک سین نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، میرے منہ سے بے ساختہ ''ارے۔'' نکل گیا، ''کیا ہوا ممی۔'' نوشین اور جاوید نے ایک ساتھ سوال کر دیا۔

کمپنی کی ملازمت، پھر دوسری عمارت کا فلیٹ۔ ویسے ذاتی طور سے بھی لوگ فلیٹ کرایہ پر لے کر رہتے ہیں! اسے چھوڑیئے۔ واپس چلیں۔ آج ایک نئے ریسٹورینٹ میں کھانا کھانے کا پروگرام ہے۔؟

میں نے کچھ کہے بغیر اثبات میں گردن ہلادی۔ ریسٹورینٹ کی رونقیں میرے لئے نئی نہیں تھیں۔ پچھلے بیس دن کے قیام میں نہ جانے کتنے ہوٹلوں میں کھانا کھا چکی تھی۔ تقریباً تمام مال گھوم گھوم کر تھک چکی تھی۔

دوسری صبح حسب معمول بالکنی میں پہنچی اور سامنے فلیٹ کے خالی باکس میں کبوتروں کے بجائے۔ اے۔ سی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میں نے نوشین کو آواز دی۔

''کیا ہے ممی۔'' وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دیکھو۔ کل اس باکس میں کبوتر تھے، آج اے۔ سی رکھا ہوا ہے۔ رات بھر میں منظر بدل گیا۔

ہاں تو۔؟ اس فلیٹ میں کوئی آ گیا ہے رہنے کے لئے۔''

''اور وہ کبوتر۔؟''

نوشین میرے سوال پر بے ساختہ ہنس پڑی۔'' آپ ذرا اوپر دیکھئے۔ چوتھی، پانچویں منزل پر۔ دیکھئے تو بے شمار کبوتر بسیرا کئے ہوئے ہیں۔ اگر یہ بھی کسی کو الاٹ ہو جائیں گے تو آپ کے کبوتر کسی اور ڈبے یا ان کھلے پنجروں میں آباد ہو جائیں گے۔

واقعی عجیب بات ہے، میں نے سوچا، ایک طرف آسائشوں اور راحتوں کا حسین جال بچھا کر انسانوں کو ٹریپ کر لیا جاتا ہے، انھیں شاندار مستقبل کا لالچ دے کر ان کے دانہ پانی کا انتظام کر کے خلاؤں میں معلق ان پنجروں میں قید کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف یہ قیدی انسان آزاد پرندوں کے آباد آشیانے کو چھین کر انھیں نئے ٹھکانوں کی تلاش پر مجبور کر دیتے ہیں، اور وہ ایک عمارت سے دوسری عمارت، ایک فلیٹ سے دوسرے فلیٹ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ نئے قیدی پرانے پنجروں میں آ جاتے ہیں، پرانے قیدی نئے پنجروں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں، اور پنجرے نما خالی فلیٹ ایک خاموش انتظار میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑے رہتے ہیں۔ اس بات سے بے خبر کہ ان کا اگلا قیدی کون ہوگا۔؟

□□□

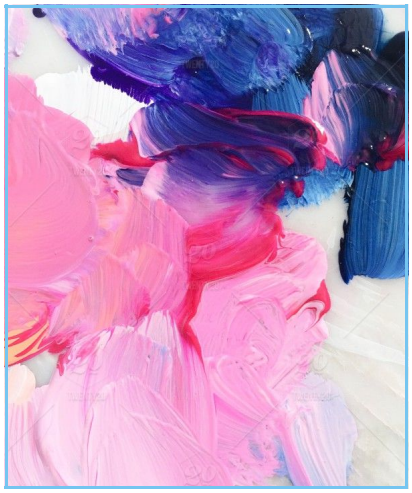

قصۂ آدم و ابلیس

محمود یٰسین

28/H/9A

سرسید احمد روڈ

کولکاتا

رابطہ: 7980323571

Imagination is more important than knowledge.

(Albert Einstein)

خدائے بزرگ و برتر نے انسان کو زمین پر اپنا نمائندہ بنا کر بھیجنا چاہا، تو فرشتوں کو اچنبھا ہوا: ہم دن رات ان کی حمد و ثنا میں لگے رہتے ہیں، پھر یہ بیٹھے بٹھائے ان کو ایسی کیا ضرورت آن پڑی کہ ایک بالکل ہی نئی مخلوق بنا کر دنیا میں بھیجنا چاہ رہے ہیں؟ پتہ نہیں، ہماری عبادت سے ان کا دل بھر گیا ہے کیا؟ بہر حال، معمولی ردوقدح کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور فوراً راضی بہ رضا ہو گئے۔ لیکن ابلیس سینہ سپر ہو گیا: بھئی، میں آگ سے بنا ہوں؛ بھلا آگ اور مٹی کا کیا مقابلہ؟ ابلیس کا اپنے منہ میاں مٹھو بننا خدا کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ لہٰذا انہوں نے بلا تامل اسے فوراً راندۂ درگاہ کر ڈالا۔ جب ساری تعریفیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہیں۔ تو پھر اس میں اس نیک بخت کو اپنی ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت تھی؟ خواہ مخواہ فرشتوں میں اپنی بزرگی، علمی لیاقت اور ساری عبادت کا کباڑہ کر کے رکھ دیا! فرشتے سب ڈرے سہمے سے، چپ سادھے، اسے محض دیکھتے ہی رہ گئے۔ خدا سے آنکھیں ملانے کی ان میں جرأت ہی نہیں ہو رہی تھی — غالباً یہ ان کے دل کا چور تھا، جو وہ یوں دم سادھے ہوئے تھے: کیوں کہ پہلے پہل اعتراض تو انہوں نے ہی کیا تھا۔

قصہ کوتاہ! راندۂ درگاہ ہونے کے بعد، ابلیس نے خدا سے مہلت مانگی کہ اسے جان کی اماں ملے! اور یہ اجازت دی جائے کہ وہ مٹی کی بے مائگی اور آگ کی بزرگی ثابت کر سکے! خدا نے کہا:

''بصد شوق!''

پھر کیا تھا؟ ابلیس کے تو ایک دم سے وارے نیارے ہو گئے! اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ وہ انسان کو اس کی نیکی اس کے اعمال سے نہیں — اس کے عقل و تدبر، اس کی سوچ و فکر سے بہکائے گا: اسے بالکل حواس باختہ اور مخبوط الحواس بنا کر رکھ چھوڑے گا۔

وہ انسان کو خود ستائی کے جال میں ایسا پھانسے گا کہ وہ تا حشر اس سے نکل نہ پائے گا۔ پھر میں اسے اپنی آنکھوں سے راندۂ درگاہ ہوتے ہوئے دیکھوں گا۔ اور تب ہی میرے دل کو سکون اور چین میسر آئے گا!

ابلیس دراصل فرشتہ نہیں، ایک جن تھا۔ فرشتوں اور جنوں میں خدا کا سب سے برگزیدہ بندہ، اور بڑا عالم و دانا! کسی حدیث کی رو سے وہ فرشتوں کا استاد بھی مانا جاتا ہے۔ بڑا زود فہم — معاملے کی تہہ تک جلد پہنچ جانے کی بے پناہ صلاحیت کا مالک۔ نہایت باریک بین! اور ایک اندازے کے مطابق فرشتوں نے اول اول جو احتجاج بلند کیا تھا، ممکن ہے، وہ ابلیس کی سیکھ کا ہی نتیجہ رہا ہو۔

جب ہی نا اس نے اپنی پیش بینی کے تحت خالقِ کون و مکاں سے اس کے کسی بھی معاملے میں مداخلت نہیں کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔ مگر وہ جو کچھ سمجھ رہا تھا، ویسا کچھ ہرگز نہیں تھا: مثلاً ممکن ہے، اس نے سوچا ہوگا: اب خدائے بزرگ و برتر کے لیے 'اب پچھتاوے کا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت' والی کیفیت پیدا ہوگئی ہوگی یا پیدا ہو جائے گی؟ لیکن حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ خدا، بہرحال خدا ہے — سب کا خالق و مالک، بڑی قوت والا، ہر شئے پر مکمل قدرت رکھنے والا بھلا ابلیس کی کیا مجال جو انہیں چکر میں ڈالے۔ بلکہ اپنی بدبختی سے چکر میں تو اب وہ خود پھنس کر رہ گیا ہے — قیامت تک کے لیے! اب اسے ایک پل بھی چین کہاں نصیب؟ بے چارہ ایک اکیلی جان! آخر کہاں کہاں دوڑتا بھاگتا یا کودتا پھاندتا پھرے؟ انگلستان، فرانس، اطالیہ، اسپین، چین، جاپان، ہندوستان، روس، امریکہ یا سعودی عربیہ؟ پھر ہر سال، نہیں بلکہ ہر آن، مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی کا فیصد تناسب تو اسے اور بھی الجھن میں ڈالے ہوئے تھی۔ خدائے عزوجل شانہٗ کا کیا؟ ان کی قدرت کے کیا کہنے؟ کیسا ہی مہیب مسئلہ کیوں نہ ہو — کتنا ہی سنگین یا پیچیدہ؟ بس، انہوں نے صرف کن کہا اور ہو گیا آناً فاناً ان کا من چاہا فیصلہ! بالکل صحیح، مناسب، معقول اور قطعی طور پر فطری — یعنی سب کے لیے یکساں اور قابلِ قبول! انہیں کہاں اِدھر اُدھر جانے کی ضرورت ہے؟ اپنے بندوں کو ابلیس کے ہتھ کنڈوں سے بچانے یا محفوظ رکھنے کے لیے؟ وہ تو ہر جا، یعنی ہر جگہ موجود، اور خاص کر ہماری شہ رگ سے بھی کہیں زیادہ ہم سے قریب ہے: ہماری ہدایت اور رہنمائی کے لیے! انسان کو ورغلانے، بہکانے اور راہِ عمل سے بھٹکاتے رہنے کا مسئلہ تو محض ابلیس کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے: وہ آخر کہاں کہاں جائے، کس کس کو اپنی بوالہوسی کے جال میں پھانسے اور کس کس کو بے کار سمجھ کر چھوڑ دے؟

حالاں کہ بالکل ابتدا میں تو وہ اپنا ہر کام نہایت آسانی کے ساتھ سرانجام دے ڈالتا تھا — اسے اپنی ناکامی کا ذرا بھی احساس کبھی نہ ہوا: مثلاً ہمارے باپ حضرتِ آدمؑ اور ماں حوّا کو اس نے بڑی آسانی سے جنت سے بے دخل کروا دیا۔ پھر ان کی اولاد یعنی ہمارے بھائی ہابیل و قابیل کے مابین منافرت بھی اس نے نہایت آسانی سے پیدا کر ڈالی۔ جس کے نتیجے میں زمین پر اوّل اوّل قتل جیسا مذموم اور ہیبت ناک فعل بنی نوعِ انسان سے سرزد ہوا! لیکن جوں جوں زمین پر آبادی کا تناسب بڑھتا گیا۔ فرقے، سماج اور ذات پات کے سلسلے بڑھتے اور پھیلتے گئے — نئے نئے اور بھانت بھانت کے ممالک بنتے گئے، اس کا اپنے کام میں قدم قدم پر رخنہ پڑنے کا احساس بھی تیزی سے بڑھتا گیا۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا: کیا کرے، کہاں جائے؟

سب سے پہلے اس نے آفاق کے اس کونے یا کنارے سے لے کر اس کونے یا کنارے تک کی اچھی طرح چھان پھٹک یعنی scanning شروع کی کہ کہاں سے اسے اپنا کام از سرِ نو شروع کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے، تاکہ وہ جلد سے جلد اپنا کام مکمل کر کے اپنے معبود کے پاس واپس پہنچ سکے اور اپنے مشن کے accomplishment کا مژدۂ جاں فشاں نہایت فخر اور والہانہ پن سے گوش گزار کر کے ان سے اپنے banishment کا قضیہ ختم کروانے یا فوری طور پر التوا میں ڈالنے کا متمنی ہو! اس کی علمی لیاقت اس ضمن میں اس کے لیے بڑی معاون ثابت ہوئی بلکہ اسے اس مسئلے کا تیر بہدف نسخہ یا حل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ دنیا، جہاں انسان کو خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے گرچہ زمین سے نظر آنے والے بے شمار ننھے ننھے ستاروں سے بھی تقریباً سوگنا چھوٹی ہے اور جس سے خود سورج بھی جانے کتنے سو یا ہزار گنا بڑا ہے، بذاتِ خود بھی اپنے پورے حجم میں محض ایک چوتھائی وجود رکھتی ہے، جب کہ اس کے پورے تین چوتھائی حصے میں چاروں اور محض پانی ہی پانی لہریں مارتا نظر آ رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی وسعت دیکھ کر ابلیس بالکل دنگ رہ گیا۔ پھر دل ہی دل میں اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکریہ بھی ادا کیا کہ اس نے زمین کا تین چوتھائی حصہ آبادی سے بالکل دور رکھا، ورنہ خدا جانے اس کا کیا حشر ہوتا — وہ کبھی خدا کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتا!

ویسے بھی ایک بات کا کھٹکا تو ہمیشہ اس کے دل میں گھر کیے رہا تھا: وہ اندر ہی اندر پچھتاتا رہا تھا کہ ساری کائنات میں اس کی وجہ سے بڑی تباہ کاریاں ہوئیں اتنی تباہیاں و بربادیاں مچیں جو اس کا مقصد بالکل نہیں تھا۔ دراصل بنی نوع انسان کا ہر طبقہ اس کی معمولی سے معمولی اکساہٹ کو بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر تسلیم کر لیا کرتا اور اسی تن دہی سے اس پر عمل پیرا بھی ہوتا رہا جو انجام کار اکثر خود ان کی ہی تباہی و بربادی کا باعث یا سبب بنتا رہا۔ طوفانِ نوحؑ کا واقعہ اور لوطؑ کے وقت میں اہالیٔ سودوم و گوموراہ کی مکمل تباہی اور ایسی ہی ازمنہ ماقبل تاریخ (Pre-Historic Periods) کی جانے کتنی قومیں اس کی وجہ سے نیست و نابود ہوتی رہی ہیں۔ اس نے تو محض بنی نوع انسان کو بہکانے کی ذمہ داری لی تھی، اسے تباہ و برباد کرنا تو اس کا مقصد کبھی نہیں رہا تھا۔ کیوں کہ نبی نوع انسان نے تو اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔ وہ تو اس کی اپنی ہی ذرا سی

لغزش تھی اس کا غرور جس نے خود اسے اپنے معبودِ برحق کی نظروں میں معتوب ٹھہرا دیا تھا۔ جس کا نتیجہ وہ آج تک بھگت رہا ہے ورنہ اس سے زیادہ خدا کو کون عزیز تھا؟ ظاہر ہے وہ اوّل اوّل خدا کا سب سے برگزیدہ بندہ جو رہ چکا ہے!

جیسے ایک بیٹا، اپنے ماں باپ سے ناراض ہو کر گھر سے نکل جاتا ہے، اس یاددہانی کے ساتھ کہ جب تک وہ اپنی بے گناہی کا سارا ثبوت اکٹھا نہیں کر لیتا، وہ انہیں اپنا چہرہ تک نہیں دکھائے گا۔ اور یہ کہ جیسے ہی وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوا، وہ الٹے پاؤں ان کے پاس لوٹے گا اور ان سے ان کا پہلے والا پیار واپس مانگے گا۔ ممکن ہے ابلیس بھی اپنے معبود سے ایسے ہی کسی مقصد کے تحت جدا ہوا ہو۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی بالکل الٹا پڑ گیا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی اب اس maxim پر عمل درآمد کرنے کی ٹھان لی:

everything is fair in love and war.

بہرحال کائنات کی اچھی طرح scanning کر چکنے کے بعد، اس نے سب سے پہلے سرزمین ہند کو اپنا تختۂ مشق بنانے کا تہیہ کیا کہ یہاں ایک سے ایک بڑے بڑے بلوان تھے — ذہین اور ناسمجھ ہر دو طرح کے! جانے کتنے ہزار سالوں تک وہ بھارت ورش کا ناش کرتا رہا — اُن کے آپسی بھائی چارے میں کتنے ہی بھید بھاؤ ڈالے: بھرت کے حق میں کیکئی کی ممتا کو ہوا دے کر اس کے فرشتہ صفت بھائی رام کو چودہ برس کے لیے بن باس کروایا؛ راون کے ذریعہ سیتا کو ہرن کروایا، آریوں کے ذریعہ دراوڑوں کی سرکوبی کروائی، کوروؤں اور پانڈو بھائیوں کے درمیان مہابھارت کی عظیم الشان جنگ کا باعث بنا وغیرہ وغیرہ۔ پھر یہاں سے وہ دیوانہ وار یونان اور روم کو آپس میں لڑوانے کے لیے دوڑ پڑا۔

اس طرح ماسوا حضرت ابراھیمؑ کے، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانے تک تو اس کا جادو ہر ایک کے سر چڑھ کر بولتا رہا تھا۔ لیکن آغازِ اسلام سے لے کر ایک طویل اور غیر معینہ مدت تک اسے جس چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا، اس نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ صدیوں اس کی سٹّی گم رہی، تب کہیں جا کر رفتہ رفتہ اس کے اوسان بجا ہوئے: اس نے اپنی صدیوں ، ہزاروں، لاکھوں ، کروڑوں ، اربوں، کھربوں یا پتہ نہیں کتنے طویل عرصے پر محیط زندگی میں حضرات ابراھیمؑ کے بعد پہلی بار بنی نوع انسان کی ایک ایسی نسل کا سامنا کیا تھا، جو اپنے ہر فیصلے پر قطعی اٹل، دھن کی بالکل پکّی اور اپنے اعمال پر یقین کا ملہ رکھتی تھی۔ اس کے ارادوں کو متزلزل کرنا کارے دارد! اسے لگا جیسے صحیح معنوں میں معبودِ حقیقی نے اسے بنی نوعِ انسان کو بہکانے کی جو کھلی چھوٹ دے ڈالی تھی۔ وہ غالباً ان کی ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی، جس میں یا جہاں اسے منہ کی کھانی ہی تھی۔ کہ یہ وہ لوگ تھے جن کا یقین پیہم تھا کہ ان کی بندگی، عبادت اور قربانی، ان کا جینا، ان کا مرنا، غرض کہ ہر عمل سب صرف اس ایک اللہ جل شانہٗ کے لیے وقف ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے! مگر بات صرف یہیں پر آ کر ختم نہیں ہو جاتی: کہ یہ تو بے خوف و خطر بحرِ ظلمات میں بھی گھوڑے دوڑا دیا کرتے تھے — بڑے بے باک، نڈر اور جان باز! دنیا سے کبھی کچھ لیا نہیں، اسے بس صرف دیتے ہی رہنا ان کا نصب العین ہے! ابلیس کو جھرجھری سی آ گئی: جب یہ دنیا سے کچھ لیتے ہی نہیں، تو آخر انہیں کس چیز کا لالچ دیا جائے؟ ان کے ذہن کو کیسے بھٹکایا جائے؟ انہیں کیسے گمراہ یا تباہ و برباد کیا جائے؟ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا تھا! اسے اپنے معبود کی کتابِ مقدسہ کی یہ بات بھی یاد آئی: والذین آمنوا اشدُّ حُبًّا للّٰہ یعنی مومن اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں! تو واقعتاً یہ ایسے ہی سخت گولوں کی ایک کھیپ تھی جن کے آگے وہ خود کو بری طرح سے بے بس و لاچار اور بے کس سا محسوس کر رہا تھا — بالکل سرنگوں ہو کر رہ گیا تھا، وہ ان کے آگے!

وہ یہ تو بہرحال دیکھ ہی چکا تھا کہ شروع ایام میں اسلام قبول کرنے والوں کو کیسے چل چلاتی دھوپ میں، تپتی ریت پر ننگا لٹا دیا جاتا تھا، ان کے سینوں پر پتھر کی سلیں رکھ دی جاتی تھیں اور ان کے جسموں کو لوہے کی گرم گرم سلاخوں سے داغا جاتا تھا؛ پھر ان پر کوڑے برسائے جاتے تھے۔ اور وہ بلا اُف کیے، ساری اذیتیں اور تکالیف بلا تکلف جھیل لیا کرتے تھے اور ان کا پائے ثبات کبھی نہ ڈگمگاتا تھا۔ دشمن تھک ہار کر اپنی راہ لینے پر مجبور ہو جاتے تھے!

الغرض دیکھتے ہی دیکھتے، وہ اسے اپنی جگہ انگشت بدنداں چھوڑ کر ستاروں سے بھی آگے نکل گئے اور وہ خود ہونق بنا صرف خلاؤں کو گھورتا رہ گیا — اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ وہ یہ بازی بری طرح سے ہار چکا ہے۔ اور اب اس کے لیے نہ جائے رفتن ہے، اور نہ پائے ماندن! نتیجتاً وہ بری طرح سے depression کا شکار ہو گیا!

اسے daydreaming کی عادت پڑ گئی اور برے برے حوصلے شکن خیالات خوابوں کی صورت ہمہ وقت اسے ڈرانے لگے! مثلاً اس نے دیکھا کہ پتہ نہیں کیسے، وہ ایک بار پھر اپنے معبود کے سامنے نادم کھڑا ہے، شرمندہ و شرم سار سا: اس کا معبود اس سے ہمیشہ کی طرح اسی بردباری سے ہم کلام ہے:

''ارے ملعون! دھوکہ تو نے مجھے نہیں، میں نے تجھے دیا ہے۔ تجھے پتہ نہیں؟ میں خیر الماکرین بھی ہوں! میں انسان جیسی مخلوق کا خالق ہوں جسے میں نے ایک طرف تو اشرف المخلوقات کا درجہ اور اپنی صفات عطا کیں، تو دوسری طرف بھرپور طور پر تیری صفات بھی بخشی ہیں اس لیے کہ تیری طرح اس کا بھی امتحان لے سکوں۔ تیرے لیے اس گتھی کا سمجھنا یا سلجھانا آسان نہیں تھا، اس لیے تو خود اس میں الجھ کر رہ گیا اور خواہ مخواہ اپنی عاقبت بگاڑ بیٹھا! میں نے تجھے بے طرح

علم دیا تھا، مگر تو اسے سنبھال نہیں سکا اور مغرور ہو گیا۔ کم عقل! غرور تیرا شیوہ نہیں تھا کہ تو ہر شئے پر قادر نہیں — تو ایک عالم بے عمل نکلا اور میری نظروں سے گر گیا۔ بہر حال، تجھ سے مجھے جو کام لینا تھا، میں نے بنفس نفیس لے ہی لیا!''

ہوش میں آنے پر ابلیس سمجھ نہیں سکا کہ اس کے معبود کو اس سے کیا کام لینا تھا؟

ایسے برے وقت میں اسے اہل یہود و نصاریٰ بری طرح سے یاد آنے لگے جو اس کے ہم نوا، بہی خواہ اور پرانے رفیق تھے؛ اس کے ایما پر جنہوں نے پیغمبروں کے قتل سے بھی گریز نہ کیا تھا۔ اگر وہ ان سے از سر نو رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے تو عین ممکن ہے وہ اس کی موجودہ پریشانیوں کا خاطر خواہ ازالہ کرنے میں اس کی مدد کر سکیں۔

چنانچہ اپنے منصوبہ کے مطابق اس نے سب سے پہلے خاص طور پر ان لوگوں کا انتخاب کیا جو فتح مکہ کے بعد فوری طور پر ایمان لائے تھے اور اپنی اصلیت میں یہود و نصاریٰ ہی تھے اور ان کے دل و دماغ پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک طرف تو انہیں ساری دنیا پر چھا جانے کا عندیا دیا اور دوسری طرف عرب سے باہر وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ربّیوں اور پادریوں سے ملا اور ان کے دل و دماغ میں صلیبی جنگوں کا نقشہ ترتیب دینے لگا۔ اسے لگا جیسے اس نے پوری طرح سے بازی اب اپنے حق میں مار لی ہے اور یہ کہ انسانیت کے خلاف اس کا پروجیکٹ کم از کم مغرب اور عرب دیشوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ تاہم یہ احساس اسے بار بار کچوکے لگاتا رہا کہ معبودِ برحق نے انسان کو بہر حال اشرف المخلوقات کے درجے سے سر فراز کیا ہے اور یہ کوئی سیدھی سادی اور معمولی بات نہیں بلکہ اپنے اندر بڑی گہرائی اور گیرائی رکھتی ہے۔ اس احساس سے اس کا منہ ایک بار پھر لٹک گیا اور دل پھر سے بھاری ہو گیا۔

شومئی قسمت سے، ابلیس کو ایک بار پھر daydreaming نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا، جس کے دوران معبودِ برحق نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا تھا: تو دنیا کے سارے فلاحی اداروں کے چکر کاٹ، اور خاص کر ہندوستان جا اور وہاں کے ہسپتالوں کا نظارہ کر! دیکھ کہ جنہیں تو نے میری نظروں میں کافر، ملحد اور مشرک بنائے رکھا ہے وہ کس طرح دن رات میری بندگی کر رہے ہیں؟ ہر روز کیسے صبح سے لے کر دیر رات گئے تک کسی بھی طرح کے بھید بھاؤ سے پرے ہو کر — دنیا کی سیاسیات اور مذہب سے دور رہ کر — امیر و غریب، بے سہارا اور نادار لوگوں کو کیسے سہارا دیتے جا

چنانچہ اپنے منصوبہ کے مطابق اس نے سب سے پہلے خاص طور پر ان لوگوں کا انتخاب کیا جو فتح مکہ کے بعد فوری طور پر ایمان لائے تھے اور اپنی اصلیت میں یہود و نصاریٰ ہی تھے اور ان کے دل و دماغ پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اس نے ایک طرف تو انہیں ساری دنیا پر چھا جانے کا عندیا دیا اور دوسری طرف عرب سے باہر وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ربّیوں اور پادریوں سے ملا اور ان کے دل و دماغ میں صلیبی جنگوں کا نقشہ ترتیب دینے لگا۔ اسے لگا جیسے اس نے پوری طرح سے بازی اب اپنے حق میں مار لی ہے۔

رہے ہیں۔ بلکہ ہنگامی حالت (emergency) کے تحت تو یہ چوبیسوں گھنٹے مصیبت زدوں کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ جن کی یہ لوگ دل و جان سے تیمارداری کر رہے ہیں، اگر وہ ایسا نہ کر رہے ہوتے تو ان بے چاروں کی کیا درگت بنتی یہ میں جانتا ہوں تو نہیں! تو ان کا کبھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا!

اپنے معبود کی یہ باتیں، یہ تنبیہ سن کر ابلیس رو پڑا: کیا وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا؟ لیکن دھن کا پکا ہونے کے سبب اس نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور اسی لٹکے منہ اور بھاری دل کے ساتھ ایک بار پھر وہ ہندوستان لوٹ آیا، تاکہ پوری دل جمعی کے ساتھ یہاں اپنا سپنا پورا کر سکے یعنی اپنا ادھورا کام مکمل کر سکے۔ مگر اس بار اسے یہاں آ کر بڑے چرکے لگے۔ خصوصاً یہاں کی سیاست نے اسے کبھی فٹ بال، کبھی کرکٹ، کبھی ٹینس اور کبھی بچوں کے کھیلنے کی پلاسٹک کی گیند کی طرح اچھا اچھال کر رکھ دیا! اس کا سر بری طرح گھوم گیا: جی چاہا ہندوستان سمیت پوری دنیا کو ایک گیند کی طرح اپنے ہاتھوں میں لے کر اچھال دے مگر وہ ایسا کرنے سے یکسر قاصر تھا۔ یوں بھی یہ دنیا اس کے معبودِ برحق نے اپنی حکمت سے بنائی تھی جو اسے بہت پیاری تھی اور پھر سارا قضیہ اس دنیا کا ہی تو تھا جہاں انسان خدا کا نائب مقرر کیا گیا تھا۔

شروع شروع ابلیس نے جب مسلمانانِ ہند کو رام کرنے یا نشانہ بنانے کا ارادہ کیا تو اپنی علمی لیاقت سے وہ فوراً بھانپ گیا کہ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہیں اور پھر یہاں کی بھانت بھانت کی ٹولیاں اور جماعتیں؟ خدا کی پناہ! یہ خدا کے بندے تو بالکل لگتے ہی نہیں، بلکہ صریح طور پر اپنے عالموں کے بندھوا مزدور لگتے ہیں! اور اسے خوب پتہ تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اسے یاد ہے ایک daydream میں اس کے معبود برحق نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنے بندوں کے روزے، نماز، زکوٰۃ، حج اور دیگر مذہبی ارکان کی ادائیگی مثلاً ایثار و قربانی یا بلیدان کا متمنی نہیں! بلکہ انسان کی خدمت کا افضل ترین طریقہ وہ کیسے اختیار کرتے اور اپناتے ہیں وہ اسی کے متلاشی ہیں! تو گویا یہ میرے پیروؤں کا کمال ہے جو یہ ایسے ہیں : ابلیس نے سوچا ۔ چنانچہ اپنے confirmation کے لیے جی کڑا کر کے اور خود کو ان ہی کے رنگ میں رنگ کر، اس نے بھی مسجدوں کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ اس کا خیال تھا: اگر وہ ان نمازیوں کے غول میں شامل ہو کر، ان پر اپنا جال ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر یہاں بھی اپنا مشن accomplished ہی ہوا سمجھو!

حسنِ اتفاق سے ایک روز، کوئی جمعہ تھی غالباً:
ایک مسجد سے باہر فٹ پاتھ، اور اس سے لگی سڑک پر
مصلیان چٹائیاں ، چادریں اور جائے نماز بچھائے
سنتیں ادا کرنے میں مشغول تھے کہ اندرونِ مسجد اور
اس کے احاطے میں لوگوں کا اژدھام ٹھاٹھیں مار رہا تھا:
ابلیس اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلمان بس صرف اپنے
اسی ایک عمل میں ساری دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور
یہی ان کی زیست کا المیہ ہے۔ اس کی آڑ میں ان سے
جو چاہو کروالو! وہ ایک کنارے کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر
نظریں دوڑانے لگا کہ مناسب جگہ پر قدم جما سکے۔
امام صاحب غالباً خطبۂ جمعہ سے قبل دی جانے والی
تقریر کے دوران مصلیانِ مسجد کو شعور بخشنے کی کوشش
میں مشغول تھے۔ اس کی باچھیں کھل گئیں کہ یہاں
شاید وہ کوئی گل کھلا سکے! مگر یہ کیا؟ یہاں تو پانسہ ہی
بالکل الٹا پڑ گیا!

تقریر کرتے کرتے امام صاحب اچانک
جوش میں آ کر کہنے لگے: ''ہم تو اس دنیا پر تھوکتے
ہیں!''

''غضب خدا کا! یہ امام صاحب کو اچانک کیا
ہو گیا؟'' ابلیس کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ حالاں کہ اسے
تو بے حد خوش ہونا چاہیے تھا کہ مانگی مراد پوری ہو گئی تھی
: نہ ہینگ لگی، نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آیا! مگر پتہ نہیں
ابلیس کو کیوں یہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا
: معاذ اللہ! جس دنیا کو ہماری ذرا سی لغزش پر ہمیں
عاق کر دینے والے معبودِ برحق نے مسلسل چھ دنوں
کی محنت، لگن اور اپنی خاص شفقت اور حکمت سے
بنائی ہے۔

دنیا جس کی عریض و بسیط کو دیکھ کر میں خود حیران
ہوں — یہ مٹی کا دبلا پتلا، منحنی سا پتلا — ایک نہایت بے
بضاعت اور غیر صحت مند بوڑھا، جس کی کوئی بساط
نہیں، اور جو اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کی غرض
سے اس مسجد کا امام بنا ہوا ہے، محض اس دنیا کے بنانے
والے کے رحم و کرم اور خوشنودی پر، اور وہ شرم میں اس
قدر ڈوبا ہوا ہے کہ اسی دنیا پر تھوک رہا ہے، جسے بنانے
پر خود اس کے خالق کو کتنا ناز ہے! خدائے عزوجل شانہٗ
کے درد کا کوئی اندازہ تو لگائے! ایسوں کو تو میں دوزخ
میں اپنی بھرپور لپیٹ میں لوں گا!'' یہ کہہ کر اس نے سختی
سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے!

کبھی علامہ اقبال کا ایک شعر پڑھ کر ابلیس کا
ماتھا بڑے زور سے ٹھنکا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے یہ
علامہ اس کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا بنا ہوا ہے۔ اسے
سب سے پہلے اسی کا کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ یہ جاہل
قوم اگر اس علامہ کے جھانسے میں آ گئی تو سمجھ لو سارا کیا
کرایا سب دھرا رہ جائے گا۔ گو کہ اس شعر میں علامہ
نے صرف ہندوستان والوں سے خطاب کیا تھا، لیکن
درحقیقت علامہ ہندوستان کے پردے میں ساری دنیا
کے مسلمانوں سے مخاطب یا ہم کلام تھے!

ابلیس کو مسلمانوں پر بہر حال بڑا ترس آتا
ہے — خصوصاً ان مسلمانوں پر جن میں قابلیت اور علمی
لیاقت خاک نہیں، لیکن جانے کس زعم میں خود کو مومن
اور جنتی اور دوسروں کو کافر اور جہنمی گردانتے ہوئے ان
کی زبان کبھی تھکتی ہی نہیں۔ بہر حال، ان کی یہ ذہنی پس
ماندگی، اس کے حق میں بڑی ہی خوش آئند اور مستحسن
ہے۔ ورنہ یہ مسلمان اور کچھ نہیں تو محض اس شعر کا صحیح
مطلب سمجھ کر اپنی حالت سدھار لینے پر ضرور کمر بستہ
ہو گئے ہوتے۔ کیوں کہ جہاں چاہ ہے، وہیں راہ ہے:

where there is a will,

there is a way!

پھر تو میں، ابلیس سوچنے لگا، بالکل ہی چپیٹ
میں پڑ گیا ہوتا۔ ظاہر ہے: میں تو انہیں دنیا ہی سے
مٹانے یا راندۂ درگاہ کرنے کے چکر میں ہوں، تاکہ
اپنے mission کے accomplishment کا
مژدۂ جاں فزا اپنے معبود کو مزے لے لے کر سنا
سکوں۔ پھر دیکھوں گا اپنے معبود کے چہرے کا اڑتا
ہوا رنگ!

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

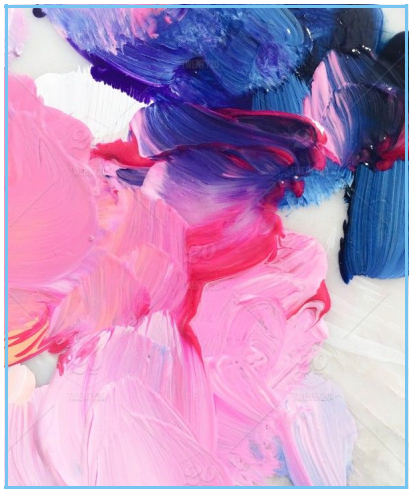

سودا

محمد علیم اسماعیل

وارڈ نمبر ۱۵

نندورا، بلڈانہ

(مہاراشٹر)

رابطہ: 7275047415

میں روشنی سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں اسے چاہتا تھا۔لیکن وہ کسی اور کو۔ یہ مجھے منظور نہیں تھا کہ اس کا جسم میرے ساتھ رہے اور روح کہیں اور۔ میں اسے مکمل طور سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔نہیں تو، پھر کچھ نہیں۔شادی کی پہلی رات، میں بے حد خوش تھا۔اور اس نے میرے ہاتھوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہہ دیا، خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا تو۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔اور حیرت سے پوچھا، کیوں؟

اس نے کہا، میں کسی اور سے پیار کرتی ہوں۔

وہ میری زندگی کی روشن رات اچانک سیاہ ترین ہوگئی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جن آنکھوں میں قوسِ قزح کے رنگ گردش کر رہے تھے وہ یک بیک اندھی ہو جائیں گی۔ میں ذہنی کرب و کسک کے بھنور میں پھنس چکا تھا۔بھوچک ہو چکا تھا۔تیز نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔پھر ترش لہجے میں سوال کیا، اور یہ شادی؟

اس نے کہا، میرے باباجی نے زبردستی کی ہے۔

اور میں نے بھڑک کر کہا، یہ تو تمہیں پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا۔

اس نے قسمت کو کوستے ہوئے سر پکڑ لیا۔اور دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئی، روتے ہوئے گڑگڑانے لگی کہ میں اسے اس کے عاشق سے ملادوں۔

رات کی لرزہ خیز خاموشی میں سرسراتی ہوئی سرد ہوا سے دونوں کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔سینا لمبی لمبی سانسوں سے پھول رہا تھا۔جیسے کوئی پرندہ اپنے آخری وقت میں پھڑ پھڑا رہا ہو۔کچھ سمجھ نہیں آیا، میں روؤں یا ہنسوں یا چیخ چیخ کر فرش سے عرش تک ہلچل مچادوں۔ مجھے ''ہم دل دے چکے صنم'' فلم یاد آ گئی اور میں نے ایثار و فراخ دلی دکھاتے ہوئے اس کی فرمائش قبول کر لی۔ یہ سوچ کر کہ ہماری کہانی کا اختتام بھی فلم جیسا ہی ہوگا۔اور وہ آخر میں مجھ سے محبت کر بیٹھے گی۔ میں ساتویں پسلی کو قوت سے نہیں حکمت سے سیدھا کرنا چاہتا تھا۔میں اس کے محبوب کی چھان بین میں جٹ گیا۔حسبِ منصوبہ روزانہ صبح گھر سے نکلتا اور در بدر کی ٹھوکریں کھا کر شام کو واپس لوٹتا۔دن بھر تلاش و جستجو میں چور چور ہو جاتا۔ہمت جواب دے جاتی لیکن دوسرے روز پھر سے تازہ دم ہو کر منہ اندھیرے ہی گھر چھوڑ دیتا۔

ایک روز وہ اداس بیٹھی ہوئی تھی۔میں گھر میں داخل ہوا اور وہ ٹھٹھک گئی۔میری جانب اس طرح دیکھنے لگی جیسے سارے جہاں کی خوشیاں اس کے قدموں تلے سمٹ آئی تھیں۔دوڑتی ہوئی میرے قریب آئی اور بانہوں میں جھول گئی۔محبت بھرے انداز سے کہنے لگی،اب مجھے چھوڑ کر مت جانا۔میں سمجھ گیا اس کے تصور میں کون ہے۔اس کے گلے لگتے ہی میرے سینے میں سرور بخش لہریں دوڑ پڑیں۔وہ لپٹی تو مجھ سے تھی پر تصور میں کوئی اور تھا۔پھر یکا یک بجلی کی رفتار سے جدا ہوئی اور کہنے لگی،دیکھو تم میرے قریب مت آنا۔

اس کے عاشق کے متعلق میں صرف اتنا جانتا تھا کہ اس کا نام راہل ہے۔اور وہ اس کے ساتھ پونہ میں گریجویشن کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔وہاں سے ہی دونوں ایک دوسرے کے رابطے میں آئے تھے۔راہل کی کھوج کرتے کرتے ہمت جواب دے چکی تھی۔لیکن ایک روز کنواں پیاسے کے پاس آ گیا۔منزل نے خود مسافر کا پتہ پوچھ لیا۔اچانک میری راہل سے ملاقات ہوگئی۔دراصل وہ خود مجھ سے آ کر ملا تھا۔اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ اپنا وزیٹنگ کارڈ تھما کر نکل گیا۔جس پر اس کی آفس کا پتہ درج تھا۔

میں دو ہفتوں تک اس کی انکوائری کرتا رہا۔پھر وہ حقیقت سامنے آئی کہ پیروں تلے زمین ہی کھسک گئی۔وہ جسم فروشی کے بازار کا دلاّ تھا۔نئے زمانے کا نیا دلال جو اپنی پرسنالٹی کے بل بوتے لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھانستا،بڑی بڑی ہوٹلوں میں،پارٹیوں میں لے جاتا،ڈرنکس میں نشیلی دوا ڈال کر بے ہوش کرتا اور ہوس کے درندوں کے حوالے کر دیتا۔

دو ہفتوں بعد میں اس کے آفس گیا۔وہ موبائل پر کسی سے لین دین کی بات چیت کر رہا تھا۔اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔میں بیٹھ گیا۔اب وہ میرے بالکل سامنے بیٹھا تھا اور میں اس کے سامنے۔بات ختم کرتے ہی وہ گویا ہوا ''اچھا تو سمیر صاحب،روشنی کے شوہر۔بھائی رومانس ہم نے کیا اور مصیبت آپ کے گلے پڑ گئی۔جب ملو تب شادی کی ہی باتیں کرتی تھی،کب آ رہے ہو میرے گھر رشتہ لے کر،مجھے لڑکے والے دیکھنے آئے تھے،ابو شادی کے لیے پریشرائز کر رہے ہیں۔لیکن میری بہانے بازی و اداکاری کام آئی اور جان چھوٹی۔''

میں نے تلوار کھینچی اور اس کے سینے کے پار کر دی۔پھر اسی تلوار سے اس کی گردن ماردی۔بنا سر کا دھڑ زمین پر ٹانگیں رگڑ رہا تھا۔اور بنا دھڑ کا سر بغیر پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔میں نے تلوار پر لگا خون اپنے جسم سے پوچھ کر تلوار ہوا میں اچھال دی۔قدر توقف اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔اور میں دھیرے دھیرے مسکرانے لگا۔مسکراہٹ قہقہوں میں تبدیل ہو گئی۔جس کی آواز سماعتوں کو ناگوار گزرنے لگی۔میں نے دیکھا وہ میرے سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔جاگتی آنکھوں کے خواب میں وہ تلوار کی موت مر چکا تھا۔میں کچھ دیر تک اسے گھورتا رہا۔پھر کہا ''اسے بھول جاو۔''

''یاد ہی کب کیا تھا جو بھول جاوں۔'' وہ پھر ہنسنے لگا۔

میں من ہی من سوچنے لگا ''یہ میں کیا پاگل باتیں کر رہا ہوں۔روشنی کا دیوانہ وہ نہیں،میں ہوں۔''

میں نے کھنکار کر کہا ''میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں لیکن وہ تمہاری دیوانی ہے۔جبکہ تم اس سے پیار نہیں کرتے۔تم اسے اپنی حقیقت بتا دو۔''

''ابے مجھے کیا پاگل کتّے نے کاٹا ہے۔''

''نہیں تو میں بتا دوں گا۔''

''یقین نہیں کرے گی۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو۔''

''وہ میری دیوانی ہے تو اسے مجھے سونپ دو۔تمھیں بھی اچھے خاصے روپے مل جائیں گے۔ہمارے ساتھ کام کرو خوب کماو گے۔''

ٹیبل پر ہاتھ پٹخ کر میں نے چلایا ''تمہاری طرح کسی کے یقین واعتماد کا خون کر کے دولت کمانا مجھے منظور نہیں۔''

میں وہاں سے گھر چلا آیا۔اس کی ایک ایک حقیقت میں نے روشنی کو بتائی کہ وہ لڑکا بہت بڑا فراڈ ہے۔لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسانا پھر انھیں جسم فروشی کے بازار میں بیچ دینا اس کا پیشہ ہے۔اسے میری باتوں کا یقین نہیں آیا۔وہ سمجھ رہی تھی میں کوئی چال چل رہا ہوں،اسے حاصل کرنے کے لیے۔

میں سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا لیکن وہ کسی صورت ماننے کو تیار ہی نہ تھی۔آخر اس کی ضد کے آگے میں ہار گیا۔اور اسے راہل سے ملانے کا فیصلہ کر لیا۔شہر کی ایک مشہور ہوٹل میں ملنا طے ہوا۔ہوٹل میں روشنی راہل سے ملی اور مجھ سے جدا ہو گئی۔علیحدگی کا درد سینے میں اچھالے مار رہا تھا۔کرب انگیز کیفیت سے طبیعت مضطرب ہوگئی تھی۔اس کے ساتھ بیتے پل پل کے ذہنی نقشے بھاگتی فلم کی طرح بڑی تیزی سے ابھر رہے تھے۔اور میں ذہنی اختلال میں مبتلا ہونے کے قریب تھا۔

جب میں اسے راہل کے پاس چھوڑ کر ہوٹل سے باہر نکلا تو میرے ہاتھ میں پیسوں سے بھرا سوٹ کیس تھا۔اور میرے ذہن میں ابھی ہوٹل کے اندر کا وہ منظر تازہ تھا جب میں راہل سے سودا کر رہا تھا۔

''کتنے ملے گے؟''

''دو پیٹی۔''

''نہیں،چار سے کم میں نہیں دوں گا۔''

میں راستے پر چل رہا تھا۔قدم قدم روشنی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ذہن کے پردوں پر سودے بازی کا وہ منظر گردش کر رہا تھا اور آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

□□□

نظمیں

کئی بار آہٹ ہوئی
اک گیا وقت
گزرا مرے پاس سے
واہمہ سا ہوا
تیرے ہونے کا مجھ کو
مگر وہ ہوا تھی
جو تنہائی کے گھر میں
پردے اٹھاتی ہوئی پھر رہی تھی

●●●

صدا کے لب سلے رہنے دو
تم بولو نہ ہم بولیں
یہ وہ لمحہ ہے جس لمحے میں
آنکھیں بات کرتی ہیں
نظر لب کھولتی ہے
بولنے لگتی ہیں تصویریں
اسی لمحے اسی وقفے میں
آوازیں پگھلتی ہیں
چٹک اٹھتی ہے خاموشی
مٹھاسیں گھلنے لگتی ہیں

قمر ادیب
ادریس گنج، ہردوئی
موبائل: 9839768113

غزل

نہ تاج و تخت، نہ قارون کا خزانہ ملے
شکم بھی سیر نہ ہو، اِتنا آب و دانہ ملے

گلیمِ فقر ملے، شانِ خسروانہ ملے
جو تجھ کو بھولوں تو عبرت کا تازیانہ ملے

بھٹک رہا ہوں میں مدت سے غم کے صحرا میں
کبھی تو ملنے کا خود سے کوئی بہانہ ملے

تمام رات رہے دُور بزمِ ساقی سے
سحر کے وقت کہاں بادۂ شبانہ ملے

اگر مکان کی خوشیاں نہیں مقدّر میں
تو سر چھپانے کو اِس شہر میں ٹھکانہ ملے

دعا کرو تھکے ہارے ہوئے ہیں دن بھر کے
بوقتِ شام پرندوں کو آشیانہ ملے

عجب نہیں ہے کہ مخمورؔ شب سے تا بہ سحر
مجھے بھی ساغرِ صہبائے عارفانہ ملے

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
۶۸۔ چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ
موبائل: 9450097929

غزل

انفرادی لاشعوری ذہن کے اندر بھی ہے
اور اک کہرام اس دہلیز کے باہر بھی ہے

پھول رُت کے زلزلوں کی سازشیں ناکام ہیں
رنجشوں کی گمشدہ بستی میں میرا گھر بھی ہے

اک سوالی سی کھڑی ہے وقت کی بے چہرگی
رینگتے لمحوں کو بوڑھے موسموں کا ڈر بھی ہے

دیکھنا یہ ہے کہ اب کس میں ہے کتنا حوصلہ
اک طرف شیشے کا گھر تو اک طرف پتھر بھی ہے

اس کو احساسِ زیاں کہئے کہ تہذیبی زوال
اپنے ہی گھر میں ہے لیکن آج وہ بے گھر بھی ہے

صبح ہوتے ہی چلے آئیں گے اب پانچوں سوار
شہر کی اونچی فصیلوں میں کشادہ در بھی ہے

اجنبی مانوس سے ہیں دھوپ میں سوکھے بدن
رندؔان بے جان چہروں میں کوئی بہتر بھی ہے

پی پی شریواستو رندؔ
R-16، سیکٹر ۱۱، نوئیڈا
موبائل: 9711422058

غزل

ہے جو حیوان نظر آتے ہیں حیوانوں میں
لیکن انساں کوئی ملتا نہیں انسانوں میں

کیوں شمار ان کا نہ دنیا کرے دیوانوں میں
ڈھونڈنے نکلے حقیقت کو جو افسانوں میں

لَو میں جلنے کا جو ہے شوق چلے آتے ہیں
جل گئی شمع یہی شور ہے پروانوں میں

جتنے گلشن ہیں زمانے کے وہ دیتے ہیں دھواں
آگ کس نے یہ لگا دی ہے کہ گلستانوں میں

ہوش مندوں کو سبق دے کے رہے گا ہر لفظ
عشق کی بات جو چھڑ جائے گی دیوانوں میں

میرؔ کی فکر کے صدقے میں بہ فیضِ قاسمؔ
منفرد لہجہ ہے خادمؔ کا غزل خوانوں میں

خادم شبیر نصیر آبادی
نصیر آباد، رائے بریلی
موبائل: 9336583604

غزل

اے مِری جانِ طرب یادنہیں
تجھ پہ مرنے کا سبب یاد نہیں

جو عقیدت سے ملا کرتا تھا
کون تھا نام و نسب یاد نہیں

بعد مدّت کے خیال آیا ہے
تم سے رخصت ہوئے کب یادنہیں

کیا بتاؤں اے مِر ی جانِ غزل
تیرے عارض، ترے لب یاد نہیں

دل میں روشن تھا جو چاہت کا دیا
بجھ گیا کیسے سبب یاد نہیں

درو کی راہ میں احباب مرے
چھوڑ کر چل دیئے کب یاد نہیں

میں بھٹکتا ہوں ابھی اے جاویدؔ
''سفر منزلِ شب یاد نہیں''

مشتاق جاوید
P-121، ٹیا برج، کولکاتا
موبائل: 9474170148

غزل

پھر فضا خوش گوار آ جائے
حاصلِ انتظار آ جائے

دل کی الجھن کو بخش دے جو سکوں
وقت وہ خوش گوار آ جائے

گیسوؤں کی جو تیرے چھاؤں ملے
میرے دل کو قرار آ جائے

وہ اگر میرے پاس سے گزرے
زندگی میں بہار آ جائے

نام وہ کیوں رہے نہ چرچے میں
لب پہ جو بار بار آ جائے

جب حسنؔ عشق کا چراغ جلے
شاعری کا شعار آ جائے

سید ابن حسنؔ
مکان نمبر 306/6/421، کشور گنج، گولڈن سٹی، کیمپ بیل روڈ، لکھنؤ
موبائل: 9454410167

غزل

خوب انجامِ خود شناسی ہے
میں بھی پیاسا ندی بھی پیاسی ہے

آئینہ دیکھنے سے ڈرتا ہوں
ہر گھڑی ایک بدحواسی ہے

میرا دشمن جو مجھ سے ہار گیا
تیرے چہرے پہ کیوں اداسی ہے

ایسا گجرا مجھے قبول نہیں
ایک اک پھول جس کا باسی ہے

خلد جیسی تھی جو زمیں کل تک
کس لیے آج کربلا سی ہے

اُس سے کہتے نہیں جو حال اپنا
یہ بھی دراصل نا سپاسی ہے

زخم ماضی کے بھول جا بسملؔ
ہر خوشی آج تیری داسی ہے

فہیم بسملؔ
ایڈیٹر سہ ماہی کاوش، ایمن زئی جلال نگر، شاہجہانپور
موبائل: 8707771203

غزل

کوئی عجب نگاہ سے کیا دیکھتا گیا
ہر تار سازِ دل کا مرے جھنجھنا گیا

بالکل بجا کہ ہے یہ اندھیرا حقیر تر
لیکن جو کل یہ محفل امکاں پہ چھا گیا

دنیا پہ ڈال دی جو اچٹتی ہوئی نگاہ
سارے جہاں کا درد مرے دل میں آ گیا

ہوش و خرد، شعور و ہنر دست و پا تو ہیں
پھر کیا ملال، جانے دو، جو بھی گیا، گیا

چپکے سے آ کے خواب میں تیرا حسیں خیال
میرے تصورات کی دنیا سجا گیا

بس دفعتاً ذرا سی توجہ جو اس نے کی
شمسیؔ مرے وجود میں سب کچھ سما گیا

شمسیؔ قریشی
محلہ عثمانپور، جلالپور، امبیڈکر نگر
موبائل: 9565059506

غزل

گرمیٔ عشق بھی عتاب تو ہے
آپ کو سوچنا عذاب تو ہے

صرف محروم ہیں قناعت سے
مال و زر گھر میں بے حساب تو ہے

پاس تہذیب ہے مجھے لیکن
تیری ہر بات کا جواب تو ہے

غم نہیں کرم خوردہ ہے تعبیر
میری آنکھوں میں اب بھی خواب تو ہے

کیا ہوا رنگ و بو سے ہے خالی
نام اس شوخ کا گلاب تو ہے

کیا ضرورت ہے جام و مینا کی
تیری آنکھوں میں بھی شراب تو ہے

دل بہک جاتا ہے جمال مگر
راہ شیطاں سے اجتناب تو ہے

جمال قدوسی
بڑھنی روڈ، اٹوا بازار، سدھارتھ نگر
موبائل: 9838813574

غزل

ہمراہ اس کے چار پہر رات ہو گئی
جس کا مجھے تھا خوف وہی بات ہو گئی

گھر سے نکل پڑی میں عدو کی تلاش میں
'اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی'

مقبول میری کشف و کرامات ہو گئی
دل کے حرم میں نور کی برسات ہو گئی

حالانکہ سارے مہرے مری دسترس میں تھے
شطرنج کی بساط پہ کیوں مات ہو گئی

سیراب تیرے لمس کی قربت نے کر دیا
منسوب تجھ سے یادوں کی بارات ہو گئی

انعام حق نوائی کا حصے میں آ گیا
مصلوب اے زمانہ مری ذات ہو گئی

اس کا نظر ہی بھر کے فقط دیکھنا ردآ
میرے لئے تو قیمتی سوغات ہو گئی

فوزیہ اختر ردآ
9/D، ٹاپ سیہ، سکینڈ لین (تیسری منزل) کلکتہ
موبائل: 7518713348

غزل

یہ آہ و نالہ و فریاد کو بہ کو کیا ہے
کوئی بتائے یہ منظر لہو لہو کیا ہے

جمال کوئی دھنک میں نہ ہے مہک میں کمال
تمہارے سامنے اوقاتِ رنگ و بو کیا ہے

یہ صرف جاننے والے ہی جان سکتے ہیں
کہاں ہر ایک پہ کھلتا ہے تو کہ تو کیا ہے

نثار ہوں ترے تن من پہ اپنے تن من سے
اب اور حاجتِ جام و مئے و سبو کیا ہے

مجھے بھی شرم سی آئے گی اور تمھیں بھی حیا
خدا کے واسطے پوچھو نہ آرزو کیا ہے

مری نظر میں ہے ماضی و حال و مستقبل
وہ شہر لکھنؤ کیا تھا ، یہ لکھنؤ کیا ہے

سخن میں حسنِ اضافی ہے خیرؔ کے دم سے
اسی کے ذکر سے خالی چہار سو کیا ہے

ڈاکٹر رؤف خیر
موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد (تلنگانہ)
موبائل: 9440945645

غزل

اُن کو مجھ سے برسرِ پیکار ہونا تھا، ہوئے
نیک نامی سے مری بیزار ہونا تھا، ہوئے

جنگلوں میں ہم نے لوٹے زندگانی کے مزے
شہر میں رہ کر انھیں بیمار ہونا تھا، ہوئے

سرخرو ہونا تھا مجھ کو اور میں ہو کر رہا
دشمنوں کو پھر ذلیل و خوار ہونا تھا، ہوئے

سخت نفرت تھی سیاست سے ہمیں پر کیا کریں
ہم کو بستی میں فقط سردار ہونا تھا، ہوئے

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ہم نے دولت کی طرف
بس ہمیں تو صاحبِ کردار ہونا تھا، ہوئے

جس طرف موجیں ہمیں لے کر چلیں، چلتے رہے
بس سمندر سے ہمیں تو پار ہونا تھا، ہوئے

کیا کریں دل کو ہمارے شاعری راس آ گئی
ہم کو یونہی دوستو بیکار ہونا تھا، ہوئے

محمد توحید الحق
اسماعیل پورہ، کانپٹی، ناگپور
موبائل: 8669061398

ارشاد احمد خاں متخلص بہ ساغر وارثی کے تازہ کلاموں کا گلدستہ بشکل مطبوعہ کتاب ''فکر کی نقاشیاں'' میرے سامنے موجود ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کے ذریعہ ۲۰۱۸ء کے آخری ماہ میں شائع ہوئی ہے۔ سرورق سے صفحہ آخر تک نہایت دیدہ زیب گرافکس اور طباعت ہے۔ اس مجموعے کو راشد ندیم اور حمید خضر نے ترتیب دیا ہے۔ ۲۰۸ صفحات کی اس کتاب میں انتساب و نذر اور فہرست مندرجات کے بعد مرتبین نے شاعر مذکور کی شاعری پر ناقدین کے خیالات عرضِ مرتبین اور شاعر کی اپنی بات کو ۵۴ صفحات پر جگہ دی ہے۔ دریں ضمن یہ عرض کردوں کہ دونوں مرتبین معروف شاعر اور موصوف کے شاگرد ارجمند ہیں انہوں نے ترتیب کتاب کے وقت نہایت سلیقگی اور خوش اسلوبی کا ثبوت دیا، اور انتہائی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین کا کام کیا، جس کو دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ساغرؔ وارثی سے کتنی عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔

شاعر جہاں دیدہ ساغر وارثی ایک معمر و موقر شخصیت کے مالک ہیں ان کے کم و بیش سات دہائیوں کے پختہ تجربات اساتذہ سخن سے لے کر شعر پسندوں تک کے سنگ پہروں کی صحبتیں، شعری محافل کی شرکتیں، محبانِ ادب کے پُر مغز مباحث اور ان پر طرہ شاہ جہاں پور کی شعری فضا ایسے میں شعری مجموعہ جات کا وجود میں آنا فطری تھا۔ ''ارتقا''، ''آہنگِ دل''، خصوصی طور پر ان کا نعتیہ مجموعہ ''نغمہ و نور'' جنھیں حلاوت جاں اور تقدیس نفس کی خاطر خوب پڑھا گیا۔ واضح کردوں کہ ساغر وارثی اصلاً غزل گو شاعر ہیں البتہ تسکین قلب اور توشۂ آخرت کی خاطر حمد و نعت بھی کہتے ہیں۔ قصہ کوتاہ چند ماہ قبل ہی یہ شعری مجموعہ ''فکر کی نقاشیاں'' منظر عام پر آیا ہے۔ جو اس وقت زیر بحث ہے۔

مجموعہ کا نام اسم با مسمیٰ ہے اس میں فکر کی تمام تر نقاشیاں موجود ہیں۔ اس مجموعہ میں ہجر کی جاں گسل صدیوں سے لے کر وصل کے حسین لمحوں تک، زاہد کی تنگ نظری سے لے کر میکدے کے مدہوش نظاروں تک، درِ جاناں میں نمناک آنکھوں سے لب و رخسار کی لذتوں تک غمِ دوراں میں مضطرب احساسات کی ترجمانی سے لے کر خوش آیند لمحوں کی چشم براہی تک، للّٰہیت اور عشق کے ذائقوں سے لے کر تصوف کی چاشنی تک پند و موعظت کی شعاعوں سے لے کر بھٹکتے ہوئے خواب زاروں تک کے تمام فلسفوں کو ساغر وارثی

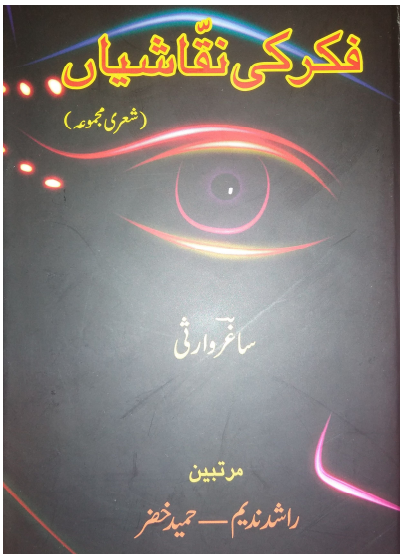

مبصر : ڈاکٹر غلام اشرف قادری
قیمت : 220 روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

ملنے کا پتہ

ادارہ سہ ماہی کاوش، ایمن زئی جلال نگر، شاہجہانپور

نے الفاظ و حروف کے جامے میں پیش کیا ہے۔ افکار اور بیانات کا فنی امتزاجی حسن ان کی سخنوری کے قد کو بلند و بالا کرتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی کے ان تمام موضوعات کو زیر بحث لانے کی ایک بہترین کوشش کی ہے، اور اس خاص روش پر چل کر انھوں نے، شاعری کی میدان میں اپنی الگ شناخت قائم کی، ان کی شاعری میں یہی وہ چیزیں جو انھیں دوسروں سے منفرد کرتی ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں کہ ساغر وارثی ایک معتبر کہنہ مشق شاعر ہیں۔ روایتی سانچہ جو قدما سے پایا تھا اس کے قالب میں شاعری عہد طفلی سے کرتے آرہے ہیں اور بڑی کامیابی کے ساتھ اب تک کا سفر طے کیا ہے۔ جہانِ شعر میں ان کا نام اساتذہ کی فہرست میں لیا جاتا ہے۔ انھوں نے دورِ جدید کے نوزائیدہ یا در آئی اصناف و اسالیب میں بھی شاعری سے احتراز نہیں کیا۔ میری مراد ہائیکو، رینگا یا تنکا جیسی شاعری سے ہے اس طرح کے قالب کو ترقی پسند شعرا نے اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے چن لیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ساغر وارثی نے درجنوں تنکا یا رینگا کو اس مجموعہ میں جگہ دی ہے۔ دس نظمیں، نو رباعیات، پندرہ قطعات اور سینکڑوں غزلیں اس کتاب کا حصہ ہیں۔ ساغر وارثی کی شاعری ہر اعتبار سے اپنے اندر ایک انفرادی خصوصیت رکھتی ہے۔ یہی وہ انفرادیت ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ حالانکہ ان کی مجموعی شاعری کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لہجہ کلاسیکیت سے استوار ہے لیکن بعض غزلوں اور بعض اشعار سے جدیدیت کی عکاسی ہوتی ہے البتہ ایسے شعر نا کے برابر ہیں۔

لیکن یہ بات بھی پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ساغر وارثی ایک استاد شاعر ہیں اور فن شاعری کی بیشتر اصناف پر خاصی دسترس رکھتے ہیں۔

شاعر موصوف کی شاعری کی بالا خصوصیات کے ساتھ ان کا یہ دعویٰ جو انھوں نے اپنی بات بعنوان ''آئینۂ فکر و خیال'' میں کیا ہے کہ قارئین خود فیصلہ کریں کہ ''کسی دوسرے کے یا اپنے ہی اگلے ہوئے نوالے تو نہیں''، ''کسی دوسرے شاعر کا سرقہ تو نہیں'' اس دعوے کی صداقت کے لیے کتاب کا مطالعہ لازمی ہے اور اگر ان کا دعویٰ سچ ہے تو ہمیں بھی ایک استاد شاعر مان لینا چاہیے دنیا مان چکی ہے۔

❑❑❑

وزیراعظم جناب نریندر مودی کو اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ وارانسی میں
دین دیال اپادھیائے ہست کلا سنکل بڑالال پور میں کتاب پیش کرتے ہوئے (۶؍جولائی ۲۰۱۹ء)

وزیراعظم جناب نریندر مودی کو اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ
وارانسی میں آنند کانن نوگرہہ واٹکا میں پیپل کا پودا بطور تحفہ دیتے ہوئے (۹؍جولائی ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ لوک بھون میں وزیراعلیٰ ہیلپ لائن 1076 کا لوگو لانچ کرتے ہوئے۔
ساتھ میں ہیں نائب وزیراعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما اور وزیر برائے اقلیتی بہبود و وقف جناب محسن رضا (۴؍جولائی ۲۰۱۹ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اجودھیا میں
۲۶ ویں علاقائی زرعی سائنس مراکز کی سالانہ ورکشاپ کے موقع پر
شجر کاری کرتے ہوئے (۸/جولائی ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ
اپنی سرکاری رہائش گاہ پر 'اسمائل مشال جیوتی آشیرواد پروگرام' کے
افتتاح کے موقع پر (۱۴/جولائی ۲۰۱۹ء)

वर्ष : 74 अंक 3
जूलाई 2019
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, **f'kf'kj]** निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सैयद आसिम रज़ा**